گمشدہ شہر کی داستان

احمد جاوید

گمشدہ شہر کی داستان

(افسانے)

احمد جاوید

*

گندھارا

ضابطہ

اشاعت اول : جنوری 2002
تعداد : 500
طباعت : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
کمپوزنگ : ندیم احمد خان
قیمت : 85 روپے

ملنے کا پتا
گندھارا بکس
خالدہ سردار پلازا' سید پور روڈ' راولپنڈی
فون 4417191

یوسف حسن کے نام

۱۹۷۰ - ۱۹۸۰

کھیل تماشہ ۹
مصاحبین خاص ۱۲
گمشدہ شہر کے شعبدہ گر ۱۹

گمشدہ شہر کی داستان ۳۱
گدھ ۳۵
جلتی بجھتی رات ۴۱
سن تو سہی ۴۸

کانچ کا شہر ۵۷
شیشے کی گلیاں ۶۱
کیا جانوں میں کون ۶۹
اور پھر خودکشی ۷۳

کون سنے گا ۸۱
جب اس نے سنا ۸۵
آخر شب ۸۸
ٹھنڈی نیند کی کونپل ۹۲

تصانیف

غیر علامتی کہانی (افسانے)

چڑیا گھر (افسانے)

گم شدہ شہر کی داستاں (افسانے)

پیادے (ناول زیر طبع)

گمشدہ شہر کے شعبدہ گر

کھیل تماشہ

جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو ابھی پو پھوٹ رہی تھی چڑیوں کی چہکار کا آغاز تھا۔ ان کے ہنگام سے گلیوں میں ہجوم ہو گیا۔ عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگیں۔ بچے اپنے اپنے کھیل چھوڑ دائرہ در دائرہ اکٹھے ہونے لگے۔ انہوں نے چہروں سے نقاب اتارا۔ سفر کی گرد پونچھی۔ تن کر کمر سیدھی کی... شہر نے تالیاں پیٹیں، سیٹیاں بجائیں... انہوں نے جھک کر آداب کیا۔ کھیل آغاز ہوا۔ آن کی آن میں یوں جیسے پٹاری میں رومال رکھ کے مداری کبوتر نکالتا ہے... بڑی شان میں... ایک کھلے میدان میں.... تماشائیوں کے بیچوں بیچ... عجب اک تماشہ ہوا۔

عجب اک تماشہ ہوا کہ پہلے زمین ہموار کی گئی.... پھر نقشے کے مطابق بنیادیں کھودیں۔ پتھر پہاڑوں کے اور اینٹیں کسی بھٹے کی... سب چیزیں برابر مطابق ضرورت کے.... سیمنٹ، بجری، ریت، مٹی بھوسہ ظاہر کر کے ڈھیر کر دیا.... پھر مٹی گارہ بھر بھر کے دیواریں کھڑی کیں اور سیمنٹ لیپ دیا.... تب چھتیں ڈالیں.... پختہ دیواریں کہ شیشے کی مانند تھیں سب آرپار دکھائی دیتا تھا.... مجمع گنگ ہوا۔

یہ کیا شعبدہ گری تھی کہ پل کی پل میں اسی ایک دن کہ دن ابھی پورے طور پر نمودار بھی نہ ہوا تھا ہر کام تکمیل ہوا.... چھتیں ڈال کر ادھر ادھر ستون کھڑے کئے....باغ باغیچے بنائے، درخت لگائے، اردگرد چاردیواری کھڑی کی، کھڑکیاں اور دروازے لگائے..... مکان بنا کہ جیسے محل تعمیر ہوا..... تعمیر ہوا تو قلعی کر کے درودیوار پر پھول بوٹے بھی بنا دیئے کہ آنکھوں کو بھلے

لگتے تھے۔

اس بھلے گھر میں کوئی کمی نہ رہنے دی گئی..... گویا سب سحر تھا اعجاز تھا.... کمروں میں دریاں قالین سب بچھا دیئے' جھاڑ' فانوس لٹکا دیئے.... تصویریں ٹانگ دیں.... کارنس پہ لکڑی پتھر' کانسی کے بنے ہوئے کھلونے اور لم ڈھینگ سجا دیئے کہ زمانے کا رواج تھا.... پھر کرسیاں' میز پلنگ' ضرورت کی ہر چیز رکھ دی.... چاندنیاں بھی بچھا دیں' گاؤ تکئے بھی لگا دیئے۔ زیبائش کے لئے آرائش کے لئے کئی پل کام ہوتا رہا.... جب ہو گیا تب گھر کا دوسرا قیمتی سامان بھی اکٹھا کیا..... بڑے بڑے چوبی صندوق سونے چاندی کے بھرے ہوئے' ہیرے جواہرات سے لدے ہوئے... برتن چین و جاپان کے اور ملتان کے....

جب ہر چیز نک سک سے درست ہوئی تب آئینے نصب کر کے گھر آئینہ خانہ کیا' رونق کا بہانہ کیا.... اس رونق والے گھر کو حفاظت بھی درکار تھی اسی لئے چاروں طرف لوہے کی مضبوط باڑھ تھی کہ شیشے کی دیواروں سے اور کھڑکیوں اور دروازوں سے جو کوئی جھانکے تو ضرور عش عش کرے مگر ایرا غیرا پاؤں دھرے تو ٹکرا کر گرے غش کرے....

کیا خوب کمال تھا.... ہجوم سے نعرہ تحسین بلند ہوا.... شام ہو گئی۔

گھر رہنے کے لئے' ہنسنے بسنے کے لئے تعمیر ہوتے ہیں مگر یہ بات باعث حیرت تھی کہ جب وہ اپنا کام مکمل کر چکے تو وہاں رکے نہیں... کھڑکیاں روشن دان' دروازے احتیاط سے بند کئے.... صدر دروازہ بھی مقفل کیا... تن کر کمر سیدھی کی اک نگاہ اس مکان کو بغور دیکھا جسے انہوں نے اپنے شعبدے سے صبح و شام کے درمیان تعمیر کیا تھا... پھر ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونکی' تعریف و توصیف کی... ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال ہنستے مسکراتے کسی انجانی سمت کو نکل گئے... مجمع گنگ ہوا.... وہ عجب انداز سے آئے تھے' عجب طرح سے چلے گئے تھے.... اسرار رہ گیا تھا۔

جب رات بہت ہو گئی اور شہر اس مکان کے اندر جھانک جھانک کے سو گیا... چاروں طرف تاریکی چھا گئی.... آسمان پہ بادلوں نے گھیرا ڈال لیا... بجلی چمکنے اور گرجنے لگی.... تو وہ

چوروں کی طرح اٹھے کہ جنگل میں چھپے تھے... چہرے نقابوں میں چھپائے اور دبے پاؤں چلتے اس طرف بڑھنے لگے جہاں انہوں نے دن بھر مکان تعمیر کیا تھا... گلیاں ویران اور سڑکیں سنسان تھیں... ہوا کے ساتھ پتوں کا انبوہ رستوں پر واویلا کر رہا تھا... وہ دم سادھے ہوئے ہولے ہولے اپنے گھر کے گرد و نواح کی گلیوں میں پھیل گئے..... چابیاں ان کے ہاتھ میں تھیں مگر یہ عجب تھا کہ انہوں نے اپنے گھر کے قفل کو نہیں چھوا.... سیدھے راستے سے داخل نہیں ہوئے۔ عقب سے گئے۔ پھر کوئی نقب لگانے میں مصروف ہوا...... کسی نے دیوار پہ رسہ پھینکا... کوئی چھت میں سوراخ کر کے اندر اترا' کسی نے دیوار پھلانگی.... جب سب اندر داخل ہو گئے... پھر شور و ہنگامہ کیا.... دیواروں کی قلعی اتار دی... پھول بوٹے اجاڑ دیئے... فرش ادھیڑ دیئے... چھتیں گرا دیں... آرائش و آسائش کی ہر شے کو کہ بظاہر مشکل سے اکٹھی کی ہوئی لگتی تھی خود ہی توڑ پھوڑ دی... ویران کیا.... چوبی صندوقوں سے ہیرے جواہرات نکال چل پڑے' دست و گریبان ہوئے... پھر جس کے ہاتھ جو لگا اٹھا کر الگ ہوا مگر دوسرے اس پر ٹوٹ پڑے۔

...پل کی پل میں منظر اور ہوا... جب ہر چیز ویران ہوئی تب وہ باہر گلی میں آئے... تن کر کمر سیدھی کی... ان کے ہنگام سے گلیوں میں پھر ہجوم ہو گیا تھا.. عورتیں کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگی تھیں... آنکھیں ملتے بچے جاگ اٹھے تھے اور اب دائرہ در دائرہ حصار بنائے کھڑے تھے.... مگر ان کے چہروں پر نقاب تھے کسی نے شناخت نہیں کیا ہر کوئی حیرت میں مبتلا تھا اور سوچتا تھا خدا خبر یہ کون ہیں اور کیوں کسی پرائے کا گھر اجاڑتے ہیں... قریب تھا کہ کوئی ان کو روک کر پوچھ لیتا... مگر انہوں نے خود ہی اپنے نقاب چہروں سے الگ کر دیئے اور لوگوں کی حیرت کو بھی حیران کیا... لوگوں نے آنکھیں مل مل کے انہیں دیکھا... ایسا تماشہ انہوں نے پہلے کب دیکھا تھا.... پھر نعرہ تحسین بلند ہوا... لوگوں نے پھر تالیاں پیٹیں اور سیٹیاں بجائیں... انہوں نے جھک کر آداب کیا.. کھیل تمام ہوا....

مصاحبین خاص

کھیل تماشہ دکھانے والے جب گلیوں اور میدانوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے تو ان کی شہرت دربار تک بھی گئی اور محلات کے اندر حرم سراؤں تک میں سنی گئی...... ہر کوئی شعبدہ بازوں کے کرتب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا آرزومند ہوا...... جب سب آنکھیں منتظر ہوئیں تو تب ان کی طلبی بادشاہ کے حضور بھی ہوئی۔ کوتوال شہر کو حکم ہوا جو وہ بجالایا اور شعبدہ بازوں کو لے کر حاضر ہوا...... شعبدہ باز پہنچے تو دیکھا کہ چاروں طرف اضطراب کا عالم تھا...... سب کو کمالات دیکھنے کی آس تھی...... شہزادے، شہزادیاں، وزیر، کبیر، کنیزیں، غلام، مصاحب، بادشاہ اور مہارانیاں بہت پہلے سے دربار میں اپنے اپنے مرتبے اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق براجمان تھے اور دم سادھے بیٹھے کچھ نیا ظہور میں آنے کا انتظار کرتے تھے۔

جب وہ پہنچے اسی ساعت کرتب دکھانے کا حکم صادر ہوا...

شعبدہ بازوں کی شہرت یونہی چاردانگ نہیں تھی۔ وہ اپنے فن میں یکتا تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے رومال نکالے اور پرندے بنا کر اڑا دیئے۔ لاٹھیاں زمین پر پھینکیں جو سانپ بن کر رینگ گئے۔ پانی کو ہوا بنا کر اڑایا اور رات کو دن میں بدل دیا.... گویا سب کو دنگ کیا اور دادو تحسین کے ڈونگرے سمیٹے...... پھر فرمائشوں کا دور شروع ہوا....

جب شعبدہ بازوں نے اپنی مرضی کے کرتب دکھادیئے تو پھر فرمائشوں کا دور شروع ہوا.... آداب شاہی کا تقاضہ تھا کہ بادشاہ کی فرمائش مقدم ہو...... بادشاہ کو سب سے زیادہ چیزوں کو دوسری چیزوں سے بدلنے کا کھیل پسند آیا تھا...... عقاب کو کبوتر سے...... کبوتر کو چڑیا سے....

بلی کو چوہے سے...... سانپ کو چھچھوندر سے...... ارشاد ہوا "کیا تم آدمی کو بھی کسی دوسری چیز میں بدلنے کی اہلیت رکھتے ہو.... عرض کیا گیا.... "جو حکم حضور....

حکم ہوا "وزیر باتدبیر کو مرغے میں بدل دیا جائے...... "وزیر باتدبیر یہ سن کر کچھ بوکھلایا پھر روبرو آکر آداب بجالایا اور عرض گذار ہوا...... حضور بندے کو مرغے میں بدلنے کی کیا حاجت ہے۔ آپ کے حکم پر وہ کچھ بھی بننے کو تیار ہے...... یہ کہہ کر اس نے منہ سے مرغے کی آواز نکالی مگر مزاج شاہی کو اس کی ہیئت میں تبدیلی بھی درکار تھی۔ شعبدہ بازوں کو اشارہ ہوا۔ جس کی تعمیل ہوئی اور وزیر باتدبیر مرغے کی شکل میں زمین پر بانگیں دیتا دکھائی دیا۔ سب کی ہنسی نکل گئی۔ اب تو سب کو ایک کھیل ہاتھ آگیا...... ایک رانی نے سپہ سالار کو چوہے میں.... ایک شہزادے نے ایک مصاحب کو طوطے میں...... غرض کہ خانوادہ شاہی کے افراد نے اپنی مرضی کے ایک ایک فرد کو چنا اور جس میں چاہا بدل دیا...... دربار ایکاایکی عجیب الخلقت چیزوں کی آماجگاہ بن گیا....

کچھ دیر تو یہ کھیل ہوا پھر بادشاہ کی طبیعت اکتانے کو آئی حکم ہوا کہ سب کو ان کی اصل میں واپس لایا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا...... درباری جب اپنی اصل شکل میں واپس آئے تو خانوادہ شاہی کو قہقہے لگاتے دیکھا...... پہلے تو حیران ہوئے کہ انہیں حقیقت کا علم ہی نہیں تھا پھر خود بھی ہنسنے لگے کہ جب بادشاہ ہنستا ہو تو سب کا ہنسنا لازم ہے۔

...... تو یوں دربار شاہی میں ہر طرح کا ہنسی کھیل تھا...... سب داد دیتے تھے ہر مظاہرے پر عش عش کرتے تھے...... اسی میں صبح سے شام ہو گئی.... ہر کھیل ہوا ہر تماشہ ہوا...... لطف ایسا تھا کہ وقت گذرنے کا احساس ہی نہیں ہوا.... نہ کسی کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ نہ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی...... جی بھرتا ہی نہ تھا...... مگر کھیل تماشے کا اپنا وقت ہے امور شاہی کا اپنا اور قیلولے کا اپنا...... یہ قیلولے کا وقت تھا۔ بادشاہ نے شعبدہ بازوں کو انعام دے کر رخصت کرنا چاہا...... مگر شعبدہ بازوں کی ایک الجھن تھی جس کا پہلے رفع ہونا ضروری تھا....

شعبدہ بازوں نے دیکھا تھا کہ ایک عجب بات یہ ہوئی تھی کہ دن بھر ولی عہد سلطنت سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔ اس نے کسی کھیل پر تالی نہیں بجائی تھی، کسی پر تبسم نہیں کیا تھا، سر نہیں ہلایا تھا، انعام نہیں بخشا تھا۔ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا رنجور بیٹھا تھا بیٹھا رہا اور مڑ مڑ کر دریچوں سے باہر کھلے سبزہ زار کو دیکھتا رہا.... انعام سمیٹنے سے پہلے شعبدہ بازوں میں سے ایک سے نہ رہا گیا آگے بڑھ کر عرض گزار ہوا...... "حضور آپ کی طرف سے کوئی حکم نہیں ہوا۔

"ہم اپنی خواہشوں کو اپنے دل کی امانت گردانتے ہیں اور ان کے افشا کو مناسب خیال نہیں کرتے...." لاپرواہی سے جوابا" ارشاد ہوا۔

ولی عہد سلطنت کے انداز تخاطب میں جو طنطنہ تھا اس سے دربار میں سناٹا ہوا مگر ظل الہی کا ماتھا ٹھنکا اور انہوں نے حکم صادر کیا ..... "و یعہد سلطنت ہم چاہیں گے کہ تم اپنی خواہشوں کا اظہار کرو کہ دربار شاہی میں بادشاہ کے علاوہ کسی کا راز، راز نہیں ہوتا...."

یہ سن کر ولی عہد ناچار اٹھا اپنی مسند چھوڑی بادشاہ کے روبرو آیا کورنش بجائی اور لب کشا ہوا.... "ظل الہی ہم نے زندگی بھر اپنے لئے کچھ نہیں چاہا آپ کے مرتبے اور عظمت کے لئے چاہا...... ہماری یہ خواہش ہے کہ دریچوں سے باہر جب بھی دیکھیں آپ کا مزار مبارک دیکھیں۔"

بادشاہ یہ سن کر تلملا اٹھا.... نیام تلوار سے جدا کی...... مگر قبل اسکے کہ گستاخی کی سزا تجویز ہوتی شہزادے نے ترت اپنے بیان کو آگے بڑھایا "خدا نہ کرے کہ ہم کبھی آپ کا برا چاہیں.... آپ کا سایہ اس روئے زمین پر ہمیشہ قائم رہے...... لیکن شاہوں نے جہاں اپنے لئے اپنی مرضی کے مطابق محلات تعمیر کئے وہاں اپنی منشا کے مطابق اپنے مزار بھی اپنی زندگیوں میں تعمیر کرائے...... کہ اس میں کچھ قباحت بھی نہیں..... بس یہ ہے کہ ہماری یہ خواہش ہے کہ آپ کا مزار ہماری منشا کے مطابق ہو...."

بادشاہ کو جب اس دلیل سے اطمینان ہوا تو وہ گویا ہوا..... "اس میں الجھن کیا ہے...... کیا ہماری فرمانروا میں ہمارا ولی عہد اتنی دولت اور اتنی طاقت بھی نہیں رکھتا کہ ایک عمارت

تعمیر کر سکے...."

شہزادے نے بصد احترام عرض کیا...... "مگر حضور جو نقشہ ہم اپنے ذہن میں رکھتے ہیں اسے ایک مدت درکار ہے جبکہ ہمارے جوش و جذبہ کو انتظار کا یارا نہیں۔"

شاہی مکالمے کو سن کر شعبدہ بازوں میں سے ایک آگے بڑھا سر جھکایا اور عرض کی.....

"غالباً" ولی عہد یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے شعبدے سے یہ کام کر دکھائیں...."

"ہاں ہم یہ چاہتے ہیں...... مگر جانتے ہیں کہ یہ کام تم ناچیزوں کے بس کا نہیں"

شعبدہ باز یہ سن کر مسکرایا ایک قدم پیچھے ہٹا.... تالی بجائی.... فضا میں بادل اڑا، بجلی چمکی، جھماکا ہوا...... اور سایہ سا پھیل گیا...... درباری دنگ رہ گئے...... دریچوں کے باہر کچھ فاصلے پر ایک عالیشان عمارت کھڑی تھی کہ جس کے گنبد و مینار کے کلس سونے سے دمکتے تھے اور ان پر شیشہ گری کا کام روشنیوں سے چمکتا تھا...... گردونواح میں ترشے ہوئے باغ باغیچوں پر رنگ برنگے پھولوں کی مہکار تھی...... شہزادے کے تصور میں جو تھا سامنے آگیا...... تالیوں سے دربار گونج اٹھا..... ابھی کچھ تھا.... ابھی کچھ ہو گیا تھا....

شعبدہ گر نے شہزادے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا "حضور عالیجناب کچھ اور بھی طلب فرمایں گے...." شہزادے نے دیکھا کہ شعبدہ باز کی مسکراہٹ میں کچھ اور رمز ہی پوشیدہ تھا...... شاید طنز یا کوئی پیغام تھا.. جو کچھ بھی تھا وہ دبدبے سے پکارا "اے ناچیز تو سمجھتا ہے کہ تو نے ہماری ایک خواہش پوری کر کے کوئی معرکہ سر کر لیا ہے...... شعبدہ بازی تیرا کام ہے۔ جب تک ہم نے خواہش نہیں کی تھی تب اور بات تھی۔ جب کر دی اور تو نے اسے پورا کرنے کی حامی بھر لی تو تو پابند ہوا...... اگر تو ایسا نہ کرتا تو قابل گردن زدنی ٹھہرتا....."

"حضور ہم یہاں اسی لئے حاضر ہیں جو حکم ہو گا پورا کیا جائے گا...." اب شعبدہ بازوں نے بیک زبان کہا....

"منہ نہ کھلواؤ...... ہم کچھ ایسا کہہ بیٹھیں گے جو تم پورا نہ کر سکو گے...." شہزادے نے تنک کر کہا۔

"حکم تو کیجئے....."

شہزادے نے یہ سنا تو کچھ چپ سی اختیار کی.... سوچ میں ڈوب گیا۔ اس توقف پر دربار یکسو ہوا کہ دیکھئے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ پھر شہزادے نے اپنی نیام سے تلوار جدا کی اسے فضا میں لہرایا اور دربار کو مخاطب کر کے پکارا..... "کون ہے آج اس روئے زمین پر جو ہمارے بادشاہ معظم سے زیادہ طاقت رکھتا ہو......" جواب آیا "کوئی نہیں..." پھر اس نے ایک اور سوال کیا .... "اور کون ہے جو تخت شاہی سے بادشاہ کو الگ کر سکے......" جواب آیا..... "کوئی نہیں...."

...... شہزادے نے مڑ کر شعبدہ بازوں کو دیکھا اور کہا "سنا تم نے شعبدہ بازو...... کوئی نہیں...... آج کوئی طاقت نہیں رکھتا...... نہ کوئی بادشاہ...... نہ شعبدہ گر......"

.... یہ کہہ کر وہ فخر سے مسکرایا...... اس کی مسکراہٹ میں تمسخر تھا یا کوئی پیغام.... شعبدہ بازوں نے تالی بجائی.... بادشاہ نے نشست بدلی کچھ کہنا چاہا...... مگر اب بیکار تھا...... تیر کمان سے نکل چکا تھا...... مسند شاہی خالی پڑی تھی...... شعبدہ بازوں کا علم کام آیا تھا.... ماسوا اس کے کہ تاج شاہی گاؤ تکئے کے قریب پڑا رہ گیا تھا بادشاہ کا وجود ناپید تھا...... سب یہ دیکھ حیرت کا مجسمہ بن گئے۔

تخت شاہی کو خالی دیکھ کر بس ایک ساعت کو شہزادہ سناٹے میں آیا ہو گا...... پھر اس کے ایک مصاحب خاص نے جو ہمیشہ اس کے ہمرکاب رہتا تھا اسے چونکایا...... اور کہا "حضور کس خیال میں ڈوبے ہیں...." شہزادے نے چونک کر کہا...... "ہم مرعوب ہوئے...... ہمیں شعبدہ بازوں نے حیران کیا......" یہ سن کر شعبدہ بازوں نے پہلے فخر سے اپنا سربلند کیا پھر ادب سے جھکا دیا....

اس تماشے پر ہر کوئی محو حیرت تھا مگر سپہ سالار کو ایک اور ہی فکر لاحق تھی...... وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کڑک کے بولا "ولی عہد سلطنت شعبد بازوں کا کمال اپنی جگہ خوب ہے مگر اس کھیل تماشے میں یہ ہرگز فراموش نہیں ہونا چاہئے کہ یہ بات آداب حکومت کے منافی

ہے کہ دربار جاری ہو اور مسند شاہی خالی پڑی رہے....."

"بے شک" وزیر نے ٹکڑا لگایا...... "تخت شاہی کا ایک لمحے کو خالی رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں...."

ولی عہد سلطنت یہ سن کر گومگو کی حالت میں گیا...... اسے سوجھتا ہی نہیں تھا کہ یہ کیا مکالمہ ہوتا ہے شہزادے کے تذبذب کو دیکھ کر مصاحب خاص آگے بڑھا کچھ کانا پھوسی کی...... شہزادے کے چہرے پر تغیر آیا وہ ترت آگے بڑھا اور مسند شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا۔

اس عالم پر کچھ دیر تو سکتہ رہا پھر ملکہ **معظمہ** کا حکم گونجا.... "یہ کیا تماشہ ہوا ہے ہمیں پسند نہیں آیا.... بادشاہ سلامت کو واپس لایا جائے....."

"ہاں واپس لایا جائے...." ولیعہد بھی گویا خواب میں بڑبڑایا۔

اس میں کچھ مشکل نہیں...... شعبدہ بازوں نے ادب سے کہا.... مگر شعبدہ بازی کا قاعدہ ہے کہ جو چیز جہاں سے گم کی جاتی ہے.... پھر عین اسی جگہ واپس لائی جاتی ہے...... جبکہ اب اس جگہ آپ جلوہ افروز ہیں...."

".... یہ کیا بات ہوئی ہماری اپنی مسند موجود ہے ہم وہاں منتقل ہو جاتے ہیں......" شہزادے نے بددلی سے جواب دیا اور جواب دے کر پھر اٹھنا چاہا لیکن عین اسی وقت مصاحب خاص آگے بڑھا اور بڑے ادب سے ادھر توجہ مبذول کرائی جہاں شہزادے کی نشست تھی...... شہزادے نے دیکھا اور پھر سب نے دیکھا...... اور سب مسکرانے لگے کہ جہاں پہلے ولی عہد سلطنت براجمان تھا اب وہاں اس کا ننھا صاحبزادہ سویا پڑا تھا جو کچھ دیر پہلے اپنی کنیز کی گود میں ہمک رہا تھا...... ملکہ **معظمہ** نے حکم دیا...... "ننھے شہزادے کو جگایا جائے اور اس نشست سے ہٹایا جائے....." ملکہ کے حکم پر کنیز خاص آگے بڑھی...... مگر مسند تک نہ پہنچ سکی کہ ننھے شاہزادے کی والدہ ماجدہ زوجہ ولی عہد سلطنت آڑے آئی...... اور ادب سے گذارش کی...." کچی نیند سے ننھے شہزادوں کو بیدار کرنا محلات کے قاعدوں کے خلاف ہے..... ہمیں آداب کو ملحوظ رکھنا ہو گا...... سب حیران ہوئے کہ ایک اور مسئلہ درپیش

ہوا۔

شعبدہ بازوں کے ایک تماشے نے دربار کو عجیب صورت حال سے دوچار کیا تھا.... بادشاہ کی واپسی اسی صورت ممکن تھی جب مسند شاہی خالی ہو...... مسند شاہی کو ایک ساعت بھی خالی رکھنا دشوار تھا کہ اس بات میں ہزار طرح کے خطرے پوشیدہ تھے...... اب تو ننھے شاہزادے کی بیداری ہی ایک واحد حل تھا۔ اور اس کے لئے انتظار آڑے آگیا تھا...... ملکہ کو بھی فکر تھی اور بادشاہ کے جاںثاروں کو بھی...... جبکہ ولی عہد نے بھی فکرمندی ظاہر کی...... اسی فکر میں رات گہری ہو گئی...... دربار ہی میں سب کی آنکھیں مند گئیں...... خواب گائیں ویران پڑی رہیں...... ادھر یہ عالم تھا اور ادھر بادشاہ سلامت کی روح گلیوں اور سڑکوں پر بھٹکتی پھرتی رہی۔ ہرچند کہ اس کا وجود عدم تھا اور دکھائی نہیں دیتا تھا مگر وسوسے پھر بھی اپنی حفاظت پر اکساتے تھے کہیں کوئی جائے اماں نہ تھی۔ پھر اک خیال پر کچھ آسودگی سی محسوس ہوئی اور وہ ادھر کو ہو لیا کہ جدھر طمانیت کے کچھ آثار تھے..... تو مختصر یہ کہ یہ ایک عجیب رات تھی جو درباریوں کو دربار میں اور جیتے جاگتے آنجہانی جنت مکانی کو اس مزار مبارک میں آگئی تھی جو شعبدہ بازوں نے ولی عہد سلطنت کی آرزو پر دریچوں سے باہر ظاہر کیا تھا..... جبکہ درباری مورخ پہلے ہی مرحوم بادشاہ کے کارنامے رقم کرنے پر مامور ہو چکا تھا.....

گمشدہ شہر کے شعبدہ گر

جب امور سلطنت سے فراغت ہو..... جب سازندے ساز بجا کر اٹھ جائیں..... جب گوئیے راگ الاپ کر رخصت ہوں..... جب رقاصہ پاؤں سے گھنگرو اتار دے..... تب اک ذرا بھیس بدل کر شہر کی گلیوں کا رخ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں....

کیا مضائقہ ہے یہ جائزہ لینے میں کہ رعایا کس حال میں ہے اور اپنے ان داتا کے بارے میں کیا خیال کرتی ہے..... اس کی صبحیں کیسی ہیں اور اس کی شامیں کیسی ہیں۔

بادشاہ جب بھیس بدل کر نکلتا تو حکومت کے کارندے بھی بھیس بدل کر نکلتے..... عقل، وزیر، کوتوال شہر دائیں بائیں موجود ہوتے اور موجود ہوتے گلیوں کی نکڑ پر پہرے دار..... مگر سب بھیس بدل کر کہ ظل الٰہی کی حفاظت بھی مقصود تھی اور یہ بھی مقصود تھا کہ بادشاہ کی شناخت نہ ہو تاکہ گوہر مقصود ہاتھ آئے....

ہر چند کہ ہرکارے صبح و شام کی خبر بادشاہ تک پہنچایا کرتے تھے۔ کچھ حاجت نہ تھی کہ بھیس بدل کر نکلا جاتا..... راوی چین ہی چین لکھتا تھا..... امیر و فقیر سب چین کے دن بسر کرتے تھے اور سکھ کی نیند سوتے تھے۔ ہر چیز وافر تھی۔ امن تھا..... گلہ تھا نہ شکایت تھی..... سب بادشاہ کی سلامتی اور اس کے اقتدار کی طوالت کی دعا مانگتے تھے..... یہی خبریں تھیں..... خبروں کا انتظام عقل وزیر کے پاس تھا۔

ہر چند کہ مملکت کے ہر کونے سے اچھی خبریں آتی تھیں مگر شاہوں کو کبھی کبھی خود اپنی نگاہوں سے بھی اپنی مملکت میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھتے رہنا چاہئے جب دیگر امور

سے فراغت ہو..... تو فراغت کی شام بادشاہ بھیس بدل کر نکلتا۔

جب بادشاہ بھیس بدل کر نکلتا تو کوتوال شہر کہ بہت فرض شناس تھا پہلے سے منادی کرا دیتا اگرچہ سرگوشیوں میں جس سے چاروں طرف چین کی بنسی بجتی پھر بادشاہ بھیس بدلتا اور بھیس بدلتا عقل وزیر اور گلیوں میں نکل آتے اور دستک کرتے اور جھوٹ موٹ کہتے کہ ہم مسافر ہیں' دور دیس سے آئے ہیں..... مدد کے طلب گار ہوتے اور انہیں مدد حاصل ہوتی۔ ڈھیروں اناج..... انواع و اقسام کے کھانے..... اور ہر کوئی بادشاہ کی تعریف کرتا..... اور تعریف کرتا عقل وزیر کی اور کوتوال شہر کی..... مگر سب کچھ اس طرح کہ ظاہر نہ ہو کہ کسی نے بادشاہ کو بھیس میں پہچان لیا ہے..... سب ظاہر کرتے کہ انہوں نے انہیں مسافر جانا ہے اور مسافر جان کر مددگار ہوئے ہیں..... تو ایسا تھا۔

تو ایسا تھا کہ بادشاہ کو اطمینان ہو گیا کہ اس کی مملکت میں کوئی ایسی بات نہیں جو لوگوں کو اس کے خلاف اکسا سکے..... بھوک نہ ننگ..... لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس پر اپنا تن من دھن سب نچھاور کرنے کو آمادہ رہتے ہیں..... تو ایک بادشاہ کو اپنی رعیت سے اس کے سوا اور کیا چاہیے..... تو اس کا دل خوش ہوا۔

..... تو بادشاہ نے یہی بات دربار میں برملا کہی اور خوشی سے پھول گیا..... اور خوشی سے پھول گیا سارا دربار' وزیر اور کبیر' ملکہ اور شہزادے' شہزادیاں اور وزیر زادیاں کہ آج اس مملکت میں کوئی ایسا نہ تھا جو بھوکا ہو' جو ننگا ہو..... کوئی ایسا جو فساد برپا کر سکے..... بغاوت پر اکسا سکے.....

..... مگر جب سب ہنسی خوشی کا سامان ہو گیا..... داد و تحسین کے نعرے بلند ہو چکے تو تب شعبدہ گر کہ دربار میں ہر طرح کے شعبدہ گر بھی ہوتے ہیں۔ اپنی جگہ سے اٹھا' روبرو آیا' کورنش بجائی اور بصد ادب و احترام ملتجی ہوا کہ حضور اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کبھی بندہ بھی اس سفر میں حضور کے ہمرکاب ہو اور اپنی آنکھوں سے بادشاہ سلامت کی تحسین دیکھ کر دل کو ٹھنڈک سے لبریز کرے..... بادشاہ کو کیا اعتراض تھا بخوشی اجازت مرحمت فرمائی.....

بادشاہ نے جب اجازت مرحمت فرمائی تو عقل وزیر کا ماتھا ٹھنکا..... اور تشویش ہوئی کوتوال شہر کو..... اور وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور کچھ توقف کے بعد بادشاہ سلامت سے تخلئے میں عرض گزار ہونے کی اجازت چاہی کہ معاملہ نازک تھا.....

جب تخلیہ ہوا اور عقل وزیر اور کوتوال شہر نے بادشاہ کو امور مملکت میں شعبدہ گر کی خواہش کو مداخلت قرار دیا تو شعبدہ گر کی طلبی ہوئی اور سوال ہوا کہ وہ بادشاہ کے ہمرکاب ہونے کی خواہش کا سبب بیان کرے تو وہ گویا ہوا "ظل الٰہی..... خدا حضور کا اقبال بلند رکھے بندہ ناچیز محض اس لئے حضور کے ہمرکاب ہونا چاہتا ہے کہ عقل وزیر اور کوتوال شہر کے ہمراہ تو ظل الٰہی ظاہر کا حال جانتے ہیں مگر شعبدہ گر کے ہونے سے دل کے حال سے بھی باخبر ہوں گے..... کہ بادشاہوں کو یہ بھی مناسب ہے....."

بادشاہ اس بات پر خوش ہوا مگر عقل وزیر اور کوتوال شہر اور بھی ناخوش ہوئے اور تنگ کر سوال کیا کہ ایسا کیسے ممکن ہے اور یہ بھی کہ بادشاہ جب لوگوں کے روبرو بھیس بدل کر جاتا ہے لوگ ازخود اس کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں..... پھر کسی شعبدے کی کیا ضرورت ہے۔"

"..... ہاں کیا ضرورت ہے" بادشاہ کو بھی حیرت ہوئی..... مگر شعبدہ گر کہ ایک کایاں تھا اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی اور نہ آئی لغزش اس کی زبان میں...... وہ بادشاہ کی حیرت پہ نہیں ہکلایا بلکہ مضبوط لہجے میں عرض گزار ہوا "حضور جب دنیا سو جائے گی اور سناٹا ہو جائے گا تو یہ بندہ ناچیز شعبدہ دکھائے گا..... اور گلیوں اور گھروں اور میدانوں میں سوئی ہوئی رعیت کے خوابوں میں حضور کو شریک کرے گا..... اور حضور خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں گے کہ رعیت حضور کے بارے میں اپنا دل کن جذبوں سے بھرا رکھتی ہے....."

بادشاہ نے یہ سنا تو تجسس سے بھر گیا کہ کھیل تماشہ چاہے کسی نوعیت کا ہو لطف کو دوبالا کرے اور زندگی کو کسی نئے تجربے سے آشنا بنا دے تو اس میں برا کیا ہے اب ہرچند کہ عقل وزیر اور کوتوال شہر نے ہر کوشش کی اور ہر دلیل دی مگر بادشاہ نے ایک نہ سنی بلکہ ان کی

گوشمالی کی..... اور شعبدہ گر کی اپنے ساتھ ہمرکابی کا حکم جاری کیا.....

جب حکم جاری ہو گیا اور عقل وزیر اور کوتوال شہر کی ایک نہ چلی تو تب انہوں نے شہر میں منادی کرائی اگرچہ سرگوشیوں میں کہ آج کی شب شہر والوں کو سونے کی ممانعت ہے..... ممانعت ہے تاکہ کوئی خواب نہ دیکھ سکے..... اور شعبدہ گر ناکام ہو اور بادشاہ دلوں کے حال سے ناواقف رہے کہ اس میں ان کے لئے عافیت کا سامان تھا...

رات ہو گئی اور رات ہو کر بھیگ گئی اور سناٹا ہو گیا اور ایسا عالم ہو گیا کہ لگتا تھا شہر والے سو چکے ہوں تو اب وقت تھا بھیس بدلنے کا اور بھیس بدل کر نکلنے کا کہ آج کی شب کچھ نیا ظہور میں آنے والا تھا....

..... تو بادشاہ اور شعبدہ گر تو آگے آگے چلے اور پیچھے پیچھے چلے عقل وزیر اور کوتوال شہر اور نکل آئے شہر کی گلیوں میں..... شہر کی گلیوں میں ہو کا عالم تھا..... سب دم سادھے پڑے تھے اور لگتا تھا کہ سوئے پڑے ہوں..... مگر جاگتے تھے کہ آج کی شب کوتوال شہر کی طرف سے سونے کی ممانعت تھی....

بادشاہ نے گھر گھر دستک دی اور ہر کسی کو جاگتا پایا اور حیران ہوا کہ رات کافی ڈھل چکی تھی اور شہر کا شہر جاگتا تھا..... یہ کیا ماجرا تھا.... "یہ کیا ماجرا ہے....؟" بادشاہ گویا ہوا۔ "کیا آج شہر میں ایسا کوئی نہیں جو رات گئے پڑا سوتا ہو....."

شعبدہ گر کہ جسے ہر بات کی خبر تھی ہرچند کہ بتا سکتا تھا مگر خاموش رہا اور صرف اتنا کہا..... "ظل الٰہی سادھو سنت فقیر اپنے دل ہر طرح کی خواہشوں سے خالی رکھتے ہیں..... وہ کسی حکم کے پابند نہیں ہوتے..... وہ دنیا کی طرف سے آنکھیں بند رکھتے ہیں..... چاہے دن ہو یا رات..... کیا عجب کہ وہ اس وقت پڑے سو رہے ہوں...."

بادشاہ کے دل کو یہ بات لگی اور وہ جنگل کو روانہ ہوا..... کسی درویش کی کٹیا کی طرف..... اس طرف کہ جہاں شعبدہ گر جانتا تھا کہ ایک مجذوب پڑا سوتا ہے..... کوتوال شہر اور عقل وزیر کو تشویش ہوئی اور انہوں نے ہرکارے دوڑائے تاکہ وہ جائیں اور مجذوب کو

نیند سے نجات دلائیں یا نجات دلائیں اسے اس حیات ناپائیدار سے کہ جس سے وہ کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا..... لیکن ایسا نہ ہو سکا کہ بادشاہ کی سواری زیادہ چست اور تیز رفتار تھی..... وہ پہرے داروں کے ہمراہ ہرکاروں سے قبل پہنچا اور اس طرح پہنچا کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی..... بس سناٹا بولتا رہا.....

درویش پڑا سوتا تھا..... اپنے گھٹنے اپنے سینے سے لگائے..... اپنے بازو پر سر رکھ کے کروٹ لئے..... میٹھی نیند خوابوں سے بھری ہوئی اس کے بند پوٹوں پہ کپکپاتی تھی.....

"ہم اس کا خواب دیکھیں گے....." بادشاہ نے شعبدہ گر کو حکم دیا کہ وہ اسی لئے ہمرکاب ہوا تھا..... "جو حکم حضور....." شعبدہ گر بھی تیار تھا..... اس نے چشم زدن میں بادشاہ کو درویش کی آنکھوں میں اتار دیا اور خواب کے سفر پر روانہ کر دیا....

درویش کا خواب اس کی زندگی کی طرح آلائشوں سے پاک تھا..... ایک چٹیل میدان میں بہت سے لوگ تھے..... نورانی چہروں والے لوگ اور ان کے درمیان ا-ستادہ تھا درویش- اور بادشاہ نے دیکھا کہ وہ بھی ان کے درمیان تھا مگر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا اور درویش کی اس پر نظر تھی جو بہت جلال میں تھا..... پھر اس کی دبدبے والی آواز گونجی..... وہ بادشاہ سے کہتا تھا..... "جاگتے کیوں نہیں..... کیوں سوئے پڑے ہو....." بادشاہ نے ایسی دبدبے والی آواز پہلے کب سنی تھی..... جب سنی تو گھٹنوں سے سر اٹھایا- جب سر اٹھایا تو یوں معلوم ہوا جیسے آنکھ کھل گئی ہو- جاگ اٹھا ہو- جب اس نے ایسا محسوس کیا تو درویش کے خواب سے باہر آیا..... سامنے شعبدہ گر تھا..... اور عقل وزیر تھا اور کوتوال شہر تھا..... اور چٹائی پہ سویا پڑا درویش تھا-

بادشاہ جب درویش کے خواب سے باہر آیا تو اس نے شعبدہ گر کو بتایا کہ درویش اپنے خواب میں کیا دیکھ رہا ہے..... اور پوچھا کہ اس کا مطلب کیا ہے..... شعبدہ گر نے کہا کہ درویش کے خواب کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ امور سلطنت سے بے خبر ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے...

بادشاہ کو اس خواب پہ بڑی حیرت ہوئی اور اس نے کہا کہ یہ کیسا درویش ہے جو بے خبر ہے..... جو نہیں جانتا کہ مابدولت کی طرح کا بادشاہ اس سے قبل کیا ہوا ہوگا..... آج کون ہے جس کا انتظام حکومت ہم سے بہتر ہو..... شعبدہ گر نے سر تسلیم کیا اور عقل وزیر اور کوتوال شہر کو اطمینان ہوا۔ اب واپسی کا سفر لازم تھا۔

واپسی کا سفر پھر انہی گلیوں سے تھا جہاں انہوں نے لوگوں کو رات گئے بھی جاگتے دیکھا تھا..... مگر شہر میں داخلے سے قبل جب وہ ایک کھیت سے گزرے تو ایک جگہ انہوں نے خراٹوں کی آواز سنی..... کوتوال شہر نے دل میں خیال کیا..... معلوم نہیں یہ کون بد بخت پڑا سو رہا ہے حالانکہ اس نے تو ہر جگہ آج کی رات سونے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ مگر اس سے قبل کہ وہ خراٹوں کی آواز کو ٹال سکتا بادشاہ نے سواری رکوائی اور جاننا چاہا کہ وہ کون ہے؟..... اور کہاں سو رہا ہے.....؟

وہ ایک دہقان تھا جس کی نقاہت اس کی غشی کو ٹال نہ سکی تھی اور وہ رات کے کسی پہر نڈھال ہو کر خراٹے لینے لگا تھا..... بادشاہ نے اس کا بھی خواب دیکھنے کی خواہش کی اور شعبدہ گر نے اسے اس کی بھی آنکھوں میں اتار دیا.....

دہقان اپنے خواب میں اپنی اصل زندگی کی طرح لاغر و ناتواں نہیں تھا بلکہ تنومند اور خوشحال تھا۔ اس کے کھیت اور کھلیان میں دھول نہیں اڑ رہی تھی بلکہ اناج سے گودام بھرے تھے..... جو کوئی حاجت مند اس کے روبرو آرہا تھا اپنا حصہ پا رہا تھا..... پھر بادشاہ نے خود اپنے آپ کو دیکھا کہ جسم پر شاہی لباس ناپید تھا..... چہرے پر بدحالی کی ہوائیاں اڑتی تھیں اور وہ دامن پھیلائے دہقان کے روبرو اناج کے چند دانوں کا غرض مند ہوا تھا..... بادشاہ کو اپنی یہ حالت دہقان کے خواب میں دیکھ کر بڑی خجالت محسوس ہوئی اور طیش آیا اور بڑبڑا کر دہقان کے خواب سے باہر نکل آیا اور تلوار سونت کر دہقان کے سر پر لہرائی لیکن شعبدہ گر آڑے آیا اور سمجھایا کہ سب خواب کا خیال ہے..... کچھ بحث مباحثہ ہوا مگر پھر بادشاہ نے دہقان کا قتل موقوف کیا اور سواری آگے روانہ ہوئی.....

شہر کی فصیل پر چراغ تو روشن تھے مگر گھوڑوں کی چاپ پر کسی نے انہیں خبردار کر کے نہیں روکا...... پہرے دار تو جاگتے تھے مگر عیش و طرب میں ڈوبے تھے البتہ داروغہ شہر سویا پڑا تھا...... بادشاہ نے جلال میں چاہا کہ کوئی تعزیر کا حکم جاری کرے مگر شعبدہ گر نے اور کام کیا..... اس نے بادشاہ کو سوئے ہوئے داروغہ کی آنکھوں میں اتار دیا تاکہ وہ ایک اور خواب دیکھ سکے....

داروغہ کا خواب کیا تھا ایک دربار لگا تھا..... دربار میں عقل وزیر تخت شاہی پر جلوہ گر تھا..... جبکہ کوتوال شہر کو عقل وزیر کا منصب حاصل تھا..... پھر اس نے دیکھا کہ وہ خود یعنی بادشاہ سلامت زنجیروں میں جکڑا دربار میں لایا جا رہا تھا جبکہ داروغہ شہر کہ اب سپہ سالار اعظم تھا اس کی گرفتاری پر نازاں انعام و اکرام کا طلب گار تھا..... اس سے قبل کہ داروغہ کے خواب میں بادشاہ کو کوئی سزا سنائی جاتی وہ اس کے خواب سے باہر آگیا۔ اسے اس بھیانک خواب پر طیش آیا۔ تلوار نیام سے باہر کی اور داروغہ کی گردن اڑا دی..... یہ منظر اتنی تیزی سے وجود میں آیا کہ سب کانپ کر رہ گئے۔ بادشاہ نے عقل وزیر اور کوتوال شہر کے لئے بھی اپنے دل میں سزا وضع کی مگر اس عمل کو دربار میں واپسی تک موقوف کیا اور آگے کی راہ لی....

شہر کی گلیوں سے گزرتے بادشاہ ہر اس جگہ رکا جہاں کسی کو سوتے دیکھا۔ اب اس کی حالت کچھ ایسی عجب ہو گئی تھی کہ وہ ہر سوئے ہوئے شخص کے خوابوں کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کرنا ضروری سمجھتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ہر ایک کا خواب دیکھا مگر پریشان ہوا..... وہ سب لوگوں کے خواب میں تھا..... مگر سب برے برے خواب دیکھ رہے تھے..... ایک تیلی نے اسے اپنے کولہو پر گدھے کی جگہ باندھ رکھا تھا..... ایک موچی اس کی کھال ادھیڑ کر اس کی جوتیاں بنا رہا تھا..... دہقان نے اسے کھیت میں جوت رکھا تھا اور وہ درباری شاعر جو جاگتے میں بادشاہ کے قصیدے پڑھنے ہی سے فارغ نہ ہوتا تھا اپنے خواب میں تمام شاہی خانوادے کی ہجو لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ اس کی سلطنت میں کیسے خواب دیکھے جا رہے تھے..... کیا ہو رہا تھا....

وہ رات تو گزر گئی..... پھر صبح ہوئی دربار لگا اور بادشاہ نے طیش دکھایا..... ہر ایک کا خواب سنایا کہ شہر کا شہر بد خواہ تھا اور سبب دریافت کیا..... مصاحبوں نے بیان کیا کہ اس کا بادشاہ کو کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ سب خواب کا خیال ہے..... اور خوابوں کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے۔ بادشاہ نے سنا مگر قبول نہیں کیا۔ بادشاہ کی نازک مزاجی پر یہ بد خوابی گراں تھی۔ پہلے حکم ہوا کہ شہر کو آگ لگا دی جائے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری..... مگر مشکل یہ تھی کہ شہر نہ ہوا تو حکومت کہاں ہو گی۔ پھر حکم ہوا کہ سب کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی جائیں مگر دشواری یہ تھی کہ خواب آنکھوں سے نہیں دیکھے جاتے..... ایک تجویز یہ تھی کہ سونے پر پابندی عائد کر دی جائے اور نہیں تو خواب دیکھنا ممنوع قرار دیا جائے..... مگر سب ناممکن تھا۔ ناقابل عمل تھا۔ تب بادشاہ نے شعبدہ گر کی طرف توجہ کی کہ اسی کے سبب اسے شہر والوں کے خوابوں سے آگاہی حاصل ہوئی تھی۔

"ہاں تو اے شعبدہ گر تو کہہ کہ یہ معمہ کیسے حل ہو....." بادشاہ نے اس سے خطاب کیا۔ شعبدہ گر سمجھتا تھا کہ جہاں عقل کی حدود ختم ہوتی ہے وہاں شعبدہ کام کرتا ہے۔ وہ عقل وزیر سے بھی آگے آیا اور کوتوال شہر سے بھی اور سپہ سالار اعظم سے بھی اور بادشاہ کے روبرو آکر مسکرایا..... پھر کورنش بجائی اور عرض گزار ہونے کو لب کھولے مگر عقل وزیر کہ ایک کایاں تھا اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا اور عین اس وقت اس کی بات کاٹی جب اس کے لفظوں نے اڑان کو پر کھولے۔

"حضور..... شعبدہ گر کیا شعبدہ کرے گا کہ شعبدہ تو نظر کا فریب ہے۔ ظاہر کو باطن کرنا اور باطن کو ظاہر کرنا محض ایک تماشہ ہے۔ اور یہ کہ امور مملکت داری شعبدوں سے نہیں عقل سے انجام پاتے ہیں..... مناسب ہے کہ شعبدہ گر کو اس کی شعبدہ گری کا انعام و اکرام دے کر رخصت کیا جائے اور غور و فکر کی راہ اپنائی جائے۔" عقل وزیر نے یہ کہا اور چاروں طرف نظر دوڑائی دربار نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے اس کا حوصلہ بلند ہوا..... اس نے بات جاری رکھی...

"ظل الٰہی کیا برا ہے کہ اگر ایک ایسا قانون وضع کیا جائے کہ لوگ جو خواب میں دیکھیں صبح کو وہ بیان نہ کریں مگر جو نہ دیکھیں اسے بڑھ چڑھ کر بیان کریں۔ جب صبح ہو اور لوگ جاگیں تو ایک دوسرے سے کہیں کہ رات انہوں نے خواب میں بادشاہ کو دیکھا کہ بہت رحمدل اور رعایا سے محبت کرنے والا ہے..... اور اس کی سلطنت میں ہن برستا ہے..... دودھ کی نہریں جاری ہیں..... اور ہر کوئی چین سے زندگی بسر کرتا ہے....."

عقل وزیر کی تقریر ختم ہوئی تو دربار میں سناٹا تھا..... پھر بادشاہ نے تبسم کیا تو چاروں اطراف دادو تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ بادشاہ کو یہ خیال پسند آیا..... ایک شعبدہ شعبدہ گر نے دکھایا کہ اسے لوگوں کے خوابوں سے آگاہی بخشی اور اب ایک شعبدہ عقل وزیر نے کر دکھایا..... بادشاہ کو جب وزیر کا خیال پسند آیا تو اس نے دیر نہ لگائی..... شعبدہ گر کو انعام و اکرام دے کر رخصت کیا اور نئے قانون کا حکم جاری ہوا اور شہر میں منادی ہوئی.....

جس روز شہر میں منادی ہوئی اس دن سے چلن بدل گیا..... جیسا عقل وزیر نے کہا تھا ویسا ہونے لگا..... اب اس سلطنت میں وہ صبح ہو یا شام راوی پھر سے چین ہی چین لکھتا تھا..... رات اور دن کی تمیز نہ تھی..... کھلی آنکھیں ہوں یا بند سب سہانے خواب تھے۔(ادبیات)

گمشدہ شہر کی داستان

گمشدہ شہر کی داستان

رات بند کمروں میں سونے والوں نے جاگنے پر سروں پر آسمان دیکھا کہ جس پر سیاہ گھنگھور گھٹائیں برس پڑنے کو تلی کھڑی تھیں۔ لوگوں کی حیرت بجا تھی کہ راتوں رات یہ کیا ہوا کہ مکانوں کی چھتیں ہی غائب ہو گئیں اور وہ بھی اس صفائی سے کہ شہر کی باقی ہر شے سلامت تھی۔ لوگ پریشان ہوئے تو گھروں سے نکل ایک کھلے میدان میں اکٹھے ہونے لگے۔ تب ایک نے کہا کہ یہ سب کیا دھرا آندھی کا ہوگا کہ چھتیں آندھیوں ہی سے اڑا کرتی ہیں۔۔۔ مگر جہاندیدہ لوگوں کو اختلاف تھا کہ چھتیں اڑانے والی آندھیاں تو نیندیں بھی اڑا دیا کرتی ہیں پھر ہم سوئے کیسے رہے۔ اس بات نے لوگوں میں خوف و ہراس پیدا کیا سو طلب کر لیا گیا شہر کا پاسبان اور پوچھا گیا کہ کہو میاں تم تو شب بھر جاگتے ہو تمہی کہو کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ پاسبان لمحے بھر کو ٹھٹکا...... مگر نہ جھینپا نہ شرمایا بلکہ بے دھڑک کہا "میرا کام چڑیوں کے چہچہانے تک ہے۔ اس کے بعد میں گھر کی راہ لیتا ہوں۔ اب رات اس کے بعد بھی ہوتی ہے تو ہو مجھے اس سے غرض نہیں۔ سو کوئی الزام میرے سر نہ آئے۔"

لوگوں نے درختوں پہ بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دیکھا کہ زور زور سے بولتی تھیں اور جیسے رات کا فسانہ سناتی تھیں۔ مگر پرندوں کی زبان کون سمجھتا۔ سب مایوس لوٹنے لگے کہ ایک کو خیال گذرا کہ بوڑھے برگد تلے ایک شخص رات بھر عبادت کرتا ہے اسے رات کے ہر پہر کی خبر ہوتی ہے مگر جب لوگ اس تک پہنچے تو اس نے حقارت سے سب کو دیکھا اور کہا میں شب بھر جاگتا ہوں تو خدا سے باتیں کرتا ہوں بھلا مجھے دنیا کا کیا ہوش۔ ہاں میں آنکھیں کھلی رکھتا

سے فراغت ہو..... تو فراغت کی شام بادشاہ بھیس بدل کر نکلتے۔

جب بادشاہ بھیس بدل کر نکلتا تو کوتوال شہر کہ بہت فرض شناس تھا پہلے سے منادی کرا دیتا اگرچہ سرگوشیوں میں جس سے چاروں طرف چین کی بنسی بجتی پھر بادشاہ بھیس بدلتا اور بھیس بدلتا عقل وزیر اور گلیوں میں نکل آتے اور دستک کرتے اور جھوٹ موٹ کہتے کہ ہم مسافر ہیں، دور دیس سے آئے ہیں..... مدد کے طلب گار ہوتے اور انہیں مدد حاصل ہوتی۔ ڈھیروں اناج..... انواع و اقسام کے کھانے..... اور ہر کوئی بادشاہ کی تعریف کرتا..... اور تعریف کرتا عقل وزیر کی اور کوتوال شہر کی..... مگر سب کچھ اس طرح کہ ظاہر نہ ہو کہ کسی نے بادشاہ کو بھیس میں پہچان لیا ہے..... سب ظاہر کرتے کہ انہوں نے انہیں مسافر جانا ہے اور مسافر جان کر مددگار ہوئے ہیں..... تو ایسا تھا۔

تو ایسا تھا کہ بادشاہ کو اطمینان ہو گیا کہ اس کی مملکت میں کوئی ایسی بات نہیں جو لوگوں کو اس کے خلاف اکسا سکے..... بھوک نہ ننگ..... لوگ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس پر اپنا تن من دھن سب نچھاور کرنے کو آمادہ رہتے ہیں..... تو ایک بادشاہ کو اپنی رعیت سے اس کے سوا اور کیا چاہیے..... تو اس کا دل خوش ہوا۔

..... تو بادشاہ نے یہی بات دربار میں برملا کہی اور خوشی سے پھول گیا..... اور خوشی سے پھول گیا سارا دربار، وزیر اور کبیر، ملکہ اور شہزادے، شہزادیاں اور وزیر زادیاں کہ آج اس مملکت میں کوئی ایسا نہ تھا جو بھوکا ہو، جو ننگا ہو..... کوئی ایسا جو فساد برپا کر سکے..... بغاوت پر اکسا سکے.....

..... مگر جب سب ہنسی خوش کا سامان ہو گیا..... داد و تحسین کے نعرے بلند ہو چکے تو تب شعبدہ گر کہ دربار میں ہر طرح کے شعبدہ گر بھی ہوتے ہیں۔ اپنی جگہ سے اٹھا، روبرو آیا، کورنش بجائی اور بصد ادب و احترام ملتجی ہوا کہ حضور اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کبھی بندہ بھی اس سفر میں حضور کے ہمرکاب ہو اور اپنی آنکھوں سے بادشاہ سلامت کی تحسین دیکھ کر دل کو ٹھنڈک سے لبریز کرے..... بادشاہ کو کیا اعتراض تھا بخوشی اجازت مرحمت فرمائی.....

ہوں کائنات کی طرف سے مگر بند رہتی ہیں شہر کی طرف سے۔۔۔۔

لوگ عقیدت سے اس کے آگے جھکے اور گھروں کو لوٹنے لگے کہ راستہ روکے ایک شخص دکھائی دیا کہ جو مانوس بھی تھا اور اجنبی بھی۔ پہلے تو اسے کسی نے نہ پہچانا۔ پھر وہ شخص حیرت سے چیخا "ارے اسے کس نے آزاد کیا۔۔۔۔" تب لوگوں کو یاد آیا کہ کئی سال پہلے اس شخص کو کہیں بند کر دیا گیا تھا تاکہ لوگ اس کے پاگل پن سے نجات حاصل کریں۔ مگر حیرت اس بات کی تھی کہ وہ آزاد کیوں کر ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا چاہا مگر وہ خود ہی گویا ہوا۔ "لوگو آج صبح میرے سر سے چھت غائب تھی۔ کیا تم نے ایسا کیا۔۔۔۔؟" مگر جب اسے تمام گھروں کی چھتیں غائب دکھائی گئیں تو وہ بہت ہنسا کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ تم سوئے رہنے والوں کا سب اجڑ جائے گا۔ بولو میں نے ہی تو کہا تھا کہ شہر میں داخل ہونے والو اس کے اسرار کو سمجھو کہ یہاں راتوں کو سونے والے خاموش آندھیوں کی نظر ہو جائیں گے۔" تب لوگ نادم ہوئے اور آئندہ ہمیشہ جاگے رہنے کے عزم کا اظہار کیا اور پھر اس رات شہر والے دیر تک جاگتے رہے مگر کئی پہر گذرنے پر ایک شخص نے اپنے طور پر سوچا کہ میں اگر پل بھر کو آنکھ میچ بھی لوں تو کیا؟ میرا پڑوس تو جاگتا ہے اور پڑوسیوں نے سوچا کہ آج شہر میں جانے کتنے لوگ جاگتے ہوں گے ہمارے سونے سے شہر کا بھلا کیا اجڑے گا۔۔۔۔ اور جب چڑیوں نے چہچہانے کو لب کھولے تو شہر کا آخری آدمی بھی نیند سے مات کھا چکا تھا۔۔۔۔ اور یوں اگلے روز بہت دن چڑھے لوگ جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ آج مکانوں کے دروازے کھڑکیاں اور روشندان بھی حیرت انگیز طور پر غائب ہو چکے تھے جس سے گھروں کے منظر گلیوں اور سڑکوں سے گذرنے والوں نے صاف دیکھے تب وہ شخص کہ جو اب آزاد تھا بہت رویا اور لوگ اس کے آگے بہت شرمسار ہوئے اور سر جھکائے کھڑے رہے کہ جیسے اپنے کئے پر نادم ہوں۔ اس سے اس شخص کا حوصلہ بڑھا سو کہا اس نے "لوگو آسمان کی طرف دیکھو کہ بادل برس پڑنے کو تلے کھڑے ہیں۔ سنو تمہارے مکان تالاب کی طرح پانیوں سے بھر جائیں گے اور تمہارے لاشے گلیوں اور سڑکوں پر تیرتے پھریں گے۔ لوگو نہ سمجھو گے تو گدھیں اور چیلیں تمہارے

جسموں کی بوٹی بوٹی نوچ کھائیں گی۔ تب کون پرسان حال ہو گا؟"

لوگوں میں پھر ایک بار خوف و ہراس پیدا ہوا اور سب اپنے اپنے گھروں پہ چھپر ڈالنے اور دروازوں کے روزن بند کرنے کا سوچنے لگے اور سوچتے سوچتے رات ہوئی اور نیند نے غلبہ پایا اور سبھوں کی آنکھیں مندنے لگیں۔ تب وہ شخص چیخا کہ سنو نیند کا سیلاب تمہاری آنکھوں کے بند توڑا چاہتا ہے۔ سنبھلو..... مگر اس سے پہلے ہی لوگ خواب دیکھنے میں محو ہو چکے تھے۔

...... اور پھر جس کی آنکھ صبح سب سے پہلے کھلی سب سے پہلے حیران ہوا۔ وہ ادھر ادھر دوڑتا جاتا اور چیختا جاتا تھا کہ ہم کہاں ہیں تب لوگ جاگے اور حیران بھی ہوئے کہ واقعی ہم کہاں ہیں کیوں کہ آج تو سرے سے مکان ہی غائب تھے۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ گلیاں اور سڑکیں سلامت تھیں مگر نہ گلیوں کے کنارے مکان تھے اور نہ سڑکوں کے کنارے دوکانیں۔ سب ویران تھا جس سے لوگوں نے سب کو دیکھ لیا۔ ان کو بھی جو کبھی گھروں کی کھڑکیوں سے کبھی باہر نہ جھانکتے تھے اور ان کو بھی کہ جن کی زندگیاں سدا تہہ خانوں میں بسر ہوئی تھیں۔ آج کسی کے دائیں بائیں دیواریں نہ تھیں..... چھتوں اور دیواروں کا تو کیا مذکور؟

سو لوگ کھلے میدانوں میں پڑے تھے اور ان کا سامان ان کے آگے پیچھے بکھرا پڑا تھا اور سب دیکھتے تھے کہ کس نے کس کا سامان اپنے گھر لا ڈالا تھا۔ سو سب نادم ہوئے اور سب نے نظریں جھکائیں اور اپنا مکان خود بن گئے۔

یہ سکون دیکھ کر وہ شخص کہ جو آزاد تھا سودائی ہو گیا۔ پہلے اس نے گریباں چاک کیا پھر بال نوچے اور تب ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا کہ "بھلا ہو ان سب کا کہ جن کے دم سے شہر گم ہوا کہ اب نہ کوئی روزن ہے کہ کسی کے گھر جھانکئے اور نہ در و دیوار کہ کچھ چھپ سکے۔ سب ظاہر ہونے والا تھا سب ظاہر ہوا۔" یہ کہہ کر وہ ان سے جدا ایک کونے میں پڑ کر سو رہا لوگوں نے حیرت سے اسے دیکھا اور سوچا کہ شاید اب نیند ہی نجات کا آخری راستہ ہے۔

سو وہ نجات کے راستے پر روانہ ہوئے اور رات کا سفر شروع کیا۔ دوپہر ادھر اس شخص نے پلکیں کھولیں اور ستارہ سحری کو آسمان پر دیکھا اور رات کا اندازہ کیا اور پھر جب اپنے جسم پر نگاہ ڈالی تو حیران ہوا مگر جب لوگوں کو دیکھا تو ذرا حیرت نہ ہوئی کہ اب وہاں کچھ نہ تھا سوائے ان آنکھوں کے کہ جو دیکھ سکتی تھیں مگر کسے دیکھتیں؟ حتیٰ کہ برگد تلے بھی کچھ نہ تھا۔ مگر آنکھیں کہ جو اب بھی کھلی تھیں کائنات کی طرف سے مگر بند تھیں شہر کی طرف سے.....

(سیپ ۷۳ ۱۹ء)

گدھ

اوپر گھروں کی بالکونیوں پر بندھی رسیوں سے لٹکتے ہوئے چھوٹے بڑے گیلے کپڑے اور ان سے قطرہ قطرہ نچڑھتا ہوا پانی ان کے وہاں ہونے کا اعلان کرتا ہے جو بظاہر نہیں ہیں...... میں صدا دیتا ہوا آگے کو جاتا ہوں کہ ایک کھڑکی سے کوئی ٹوکری الٹ کر گلی میں کچرا ڈھیر کرتا ہے۔ اوپر دیکھتا ہوں کوئی سر جھانکتا دکھائی نہیں دیتا۔ ادھر ایک سمت سے کسی بچے کی گیند میرے پاس سے ہو کر نیچے لڑھکتی چلی گئی ہے۔ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز بھی آتی ہے...... مگر کون؟ کوئی بھی نہیں...... ہر سمت رونق اور چہل پہل کا گمان...... مگر حقیقت؟ حقیقت میں کچھ بھی نہیں....

حقیقت میں کچھ بھی نہیں مگر چہار سمت پھیلی ہوئی گلیاں بازار اور مکان...

میں گلی گلی گذرتا گھر گھر دستک دیتا، آگے بڑھتا جاتا ہوں...... کوئی کنڈی کھولے تو کہوں کوئی دکھائی دے تو کہوں....

کہوں تو کس سے کہوں کہ سارے آثار آبادیوں والے مگر عجب شہر ہے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہو آیا ہوں...... آدم نہ آدم ذات....

چہار سمت ترشے ہوئے باغ باغیچے اور رنگ برنگے پھول...... سربفلک عمارتیں اور ان کی آرائشی محرابیں.... کشادہ دو رویہ سڑکیں...... پانی اچھالتے خوبصورت فوارے اور ان کے گرد رنگ برنگی جلتی بجھتی روشنیاں...... موٹریں، بسیں، رکشے، سائیکلیں...... ٹریفک کا اژدھام اور کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں...... اور اس سے آگے.... بے ڈھب

مکانوں کی بے ڈھنگی قطاریں اور تنگ و تاریک گلیاں...... گلیوں کی نالیوں میں رکا ہوا متعفن پانی...... مچھر اور مکھیاں...... اور اس سے بھی آگے کچے مکانوں کی دیواروں پر تھوپے ہوئے اپلے اور مریل مویشی...... اور گدلے پانی کے کائی زدہ جوہڑ.... ویران کھیت اور کھلیان...... مگر آدمی؟

مجھے یہاں کتنے پہر گذر گئے شمار کرتا ہوں مگر حساب انگلیوں کی پوروں سے پھسل پھسل جاتا ہے کچھ حافظے کا ٹھیک نہیں....

عجب نہیں کہ شاید آدمی پہلے حافظہ گم کرتا ہو.... اپنا ماضی بھول جاتا ہو...... حافظہ گم ہو جائے تو یاد جاتی رہتی ہے...... یاد نہ رہے تو رستے فراموش ہوتے ہیں.... گھر گھر نہیں لگتا ...... دوست احباب کی شناخت گم ہوتی ہے...... اپنی پہچان بھی جاتی رہتی ہے...... آدمی سوچتا ہے میں کون ہوں......؟ اور پھر یہ میں کون؟ پھیل جاتی ہے...... آدمی گم ہو جاتا ہے......

تو آدمی گم ہو گئے ہیں.... میں انہیں تلاش کرتا ہوں....

مگر آدمی کہاں گم ہو گئے......؟ جو گم ہوئے تو پھر یہ کون بول رہا ہے......؟؟ یہ کن کی آوازیں ہیں کہ جن سے فضا بھری ہے....؟؟؟

میں سنتا ہوں اپنے بہت ہی قریب رونے اور کرلانے والوں کو' ہنسنے اور قہقہہ لگانے والوں کو اور آگے بڑھتا ہوں...... آگے کسی قلندر کا نعرہ مستانہ کوئی لہکتی ہوئی تان' گرامفون ریکارڈ' چلنت اور بھولے بسرے گیت کسی اپاہج بھکاری کے گھسٹنے اور صدا کرنے کا شور' شور اور سرگوشیاں' نعرے اور گالیاں' چیخیں اور دھماکے قہقہے اور خراٹے.... اور آگے...... اور آگے ...... دوڑنے اور بھاگنے کی...... دھیرے دھیرے چلنے کی...... گھگھیانے اور گھٹنے ٹیکنے کی...... اور آگے.... میں گلی کا موڑ مڑ کے سڑک پہ آتا ہوں....

سڑک پہ آتا ہوں کہ آوازوں کا اژدھام یہاں بھی دھکم پیل کرتا میرے آرپار ہوتا جاتا ہے...... سڑک کا وہی عالم کہ جو بازاروں میں ہوتا ہے...... کنارے کنارے دوکانیں' فٹ پاتھوں پہ ریڑھیاں اور چھابڑیاں...... ایسا عالم جیسے کاروبار گرم ہو ایک غل بپا ہے......

صدائیں آتی ہیں...... مول تول ہوتا ہے...... بک بک جھک جھک.... مال آرہا ہے...... مال جارہا ہے...... مگر کون آتا ہے' کون جاتا ہے...... بیچتا کون ہے خریدتا کون ہے...... لاتا کون ہے لیجاتا کون ہے۔ کسی کی صورت نظر نہیں آتی ایک آوازیں ہیں کہ بس وہی آتی ہیں۔ باقی آدم نہ آدم ذات....

سڑک پہ ٹریفک کا اژدھام...... گاڑیاں سائیکلیں تانگے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہیں...... مگر سوار کہاں ہیں۔ وہ کہیں بھی نہیں ہیں' جیسے سب اپنے آپ چلا جا رہا ہو...... اپنے آپ....

اپنے آپ؟؟...... کیسے ؟؟؟.... میں ٹریفک کا نظارہ کرتا ہوں کہ اچانک سڑک کے بیچوں بیچ ایک خارش زدہ کتا کسی طرف سے نمودار ہوتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے...... ٹریفک جامد ہو جاتی ہے...... ادھر کی ادھر...... ادھر کی ادھر...... سب کچھ ساکت اور جامد...... کوئی گاڑی اپنی جگہ سے نہیں ہلتی...... میں سوچتا ہوں بارے کوئی صورت تو نظر آئی آدمی نہ سہی کتا ہی سہی...... وہ کتا وہاں لوٹ لگاتا ہے دم اور کان اکڑاتا ہے...... اپنے پنجوں سے پیٹھ کھجلاتا ہے...... کچھ جماہی لیتا ہے کچھ بھونکتا ہے.. کسی گاڑی کا ہارن نہیں بجتا' کوئی آواز سنائی نہیں دیتی...... فضا سہمی ہوئی سی ڈری ہوئی سی.... اوپر آسمان پہ چیلیں دائرے میں گردش کرتی ہیں ...... اور کرلاتی ہیں...... درختوں کے پتے یک لخت پیلے پڑ جاتے ہیں...... آسمان کا رنگ گدلا جاتا ہے...... کتا کروٹ لیتا ہے اور میری طرف شست باندھتا ہے کہ میں دکھائی دیتا ہوں۔

وہ دانت کچکچاتا ہوا میری طرف آتا ہے...... میں اسے حیرت سے دیکھتا ہوں....

دیکھتا ہوں اور ہراس میں دوڑ لگاتا ہوا تنگ گلیوں کی جانب نکل جاتا ہوں.... پیچھے ہجوم کے قہقہے' گاڑیوں کے ہارن اور کتے کے بھونکنے کی آوازیں...... جیسے سبھی اسی انتظار میں تھے...... یہ بھی ایک کھیل تھا۔

گلیاں تنگ ہوتی جاتی ہیں...... میں بھاگتا جاتا ہوں...... کتا میرے پیچھے...... میرے پیچھے ...... میرے قریب...... میں بھاگتے میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں...... پیچھے کچھ بھی نہیں......

میرے ساتھ ' میرے قریب بس بھونکنے کی آوازیں...... میں کیوں بھاگ رہا تھا...... وہ کتا کیا ہوا....

میں دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہوں...... ہانپنے کی آواز جیسے کوئی دم اکڑائے پاس سے گذرتا جاتا ہو...... اب گلی خالی پڑی ہے مگر اردگرد آوازوں کا شور کہ مسلسل آتا ہے...

آوازوں کا شور اور خالی گلیاں...... میں یونہی کھڑا ادھر ادھر دیکھتا ہوں.. اور سوچتا ہوں آدمی؟ .... آوازوں سے شہر بھرا پڑا ہے مگر آدمی؟.... میں ان کا کیا کروں.. کیا کروں......؟ سوچتا ہوں...... وقت کچھ اور گذر جاتا ہے.. یہ دن کے زوال کی گھڑی ہے کہ اوپر بالکونیوں پر بندھی رسیوں پر لٹکتے چھوٹے بڑے سکھانے کو ڈالے ہوئے کپڑے اب سوکھ چلے ہیں.. کوئی لپک لپک کر رسیوں سے انہیں اتار رہا ہے.. مگر کون؟...... وہ نظر نہیں آتا...... البتہ بو آتی ہے.. کسی مردار کی بو... یہ بو سی کہاں سے آتی ہے....؟

اوپر آسمان پر گدھوں کا غول سایہ کرنے لگا ہے کہ بو...... بو آتی ہے میں ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنتا ہوں وہ تعداد میں بہت ہیں...... انہوں نے شہر کا رخ کیوں کیا...... گدھوں کے شور پر مکانوں کی ممٹیوں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کی غڑغوں غڑغوں بھی سنائی دیتی ہے...... وہ دیواروں کی سوراخوں میں ایک دوسرے کو دھکیلتے غائب ہوتے جاتے ہیں...... گدھوں نے گھروں کی منڈیروں پر لہرا کر پر سمیٹے ہیں اور پڑاؤ کر لیا ہے.. ان کی گول گول وحشت ناک آنکھیں ادھر ادھر دیکھتی ہیں اور گویا گھات لگاتی ہیں...... پھر وہ باری باری ایک کے بعد ایک مکانوں کے اندر ادھر صحنوں میں اترتے جاتے ہیں...... مکانوں کے اندر کا تعفن اور سڑاند گلیوں میں آتی ہے اور ادھر ادھر لوٹیں کھاتی ہے...... میں حیرت سے سب کچھ دیکھتا ہوں اور ناک پہ ہاتھ رکھ آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ مگر پھر وہی ایک خیال آتا ہے کہ گھروں کے اندر کیا ہے آدمی زندہ یا مردہ؟ اور پھر دستک دینے لگتا ہوں...... مگر کوئی دروازہ نہیں کھلتا ویرانی بھی نہیں کہ لوٹ جاؤں.... اندر سے ایسی ہی آوازیں آرہی ہیں جیسی آباد گھروں سے آتی ہیں.. مگر اندر کیا ہے؟ کون بتائے...... میں تھک ہار آنکھ دروازوں کی درزوں سے لگاتا ہوں......

جھانکتا ہوں اور حیران ہوتا ہے کہ اندر اور تو سب کچھ ہے مگر آدمی؟..... آوازیں تو آدمیوں جیسی مگر آدمی نہ زندہ نہ مردہ...... بس گدھوں کا غول...... اور سانپ اور بچھو...... اور کتے اور بلیاں.... اور تو سب کچھ ہے مگر آدمی نہ زندہ نہ مردہ...!!

...... میں ایک ایک گھر میں جھانکتا حیران ہوتا بدحواسی میں بھاگتا جاتا ہوں کہ میرے پیچھے کتے کے غرانے کی آوازیں پھر سنائی دینے لگتی ہیں...... جب میرے بھاگتے قدموں پر شہر کی تنگ گلیاں اور تنگ ہونے لگتی ہیں تو میں جست بھرتا شہر سے باہر نکل آتا ہوں تاکہ سینہ پھلا کر سانس تو لے سکوں....

مگر شہر سے باہر کھیتوں اور کھلیانوں پر کوے منڈلا رہے ہیں کہ شام گہری ہوتی جاتی ہے اک خوف ہے کہ دھول بن کر اڑتا ہے اور آنکھوں میں سماتا ہے...... چمگادڑوں کے بولنے کی آوازیں آتی ہیں اور گدھ بیمار مویشیوں کے سرہانے بیٹھے اونگھتے ہیں۔ ایک جوہڑ کے کنارے مینڈک ٹراتے ہیں اور ایک کتا شڑاپ شڑاپ پانی پیتا ہے۔ ایک بلی راستہ کاٹتی ہوئی تیزی سے ایک درخت پہ چڑھتی چلی گئی ہے۔ چڑیوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ گھونسلہ تنکا تنکا نیچے گر رہا ہے۔ ایک شاخ سے سانپ جھک آیا ہے جیسے کسی نے رسی پھینکی ہو۔ نیچے چٹیل میدان میں جگہ جگہ سوراخ ہیں اور بڑے بڑے چیونٹے ادھر ادھر تیزی سے آجا رہے ہیں...... میں دیکھتا ہوں چوہوں کے منہ میں گندم کی بالیاں اور چیونٹیوں کے منہ میں چینی کے دانے اور دور کچے مکانوں میں دیئے تیز ہوا کے سامنے ٹمٹما کر بجھ رہے ہیں۔ کتا جوہڑ سے پانی پی کر میری طرف رخ کرتا ہے۔ مجھ میں بھاگنے کی سکت نہیں میں اپنے بازوؤں میں جسم کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں مگر حیران ہوتا ہوں کہ میرا وجود اب میرا وجود بھی نہیں۔ شاید اسے اندھیرا کھاتا ہے کہ جو اب ہر چیز پر محیط لگتا ہے...... مگر خوف سے کپکپی ہے کہ اب بھی طاری ہے.... میں کتے کی سمت دیکھتا ہوں، مگر وہ سر جھکائے بڑی مسکینی سے میرے پاس سے گذر جاتا ہے...... میں خالی خالی سا کھڑا کسی سمت سفر کرنے کا ارادہ کرتا ہوں پھر پاؤں اٹھاتا ہوں...... مگر اٹھے ہوئے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے...... کہ جسم تو ہے ہی نہیں...... میں اک

ذرا مسرت سے کچھ سوچتا ہوں اور پھر لہریئے کھاتا ہوا کھلے آسمانوں کی سمت پرواز کرنے لگتا ہوں...... نیچے بہت نیچے کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو گیا ہے...... اور سامنے کھیت اور کھلیان اور مویشی اور گدھے اور گھوڑے جیسے پانی کی لپیٹ میں آگئے ہیں کہ دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ بستی بستی شہر شہر لوٹیں کھاتا خس و خاشاک کی طرح ہر شے کو بہاتا چلا جا رہا ہے اور عمارتیں کہ کھنڈرات کی طرح چپ چاپ سر جھکائے کھڑی ہیں جیسے بہت سے آدمی اپنے عزیزوں کی لاشوں پر رنجیدہ اور نادم ہوں.....

اور اب میں ہوں کہ پر سمیٹ کر ایک طرف بلندی پر بیٹھا کسی بھی جاندار کی جستجو میں ہوں.... زندہ یا مردہ...... کہ بھوک ستانے لگی ہے۔ (سیپ)

جلتی بجھتی رات

پاؤں میں چکر تھا..... سو رات دن کی خبر نہ تھی۔ خبر تب ہوئی جب زندگی میں ایک رات ایسی بھی آئی جو آئی اور آکر ٹھہر گئی.... میں زانوؤں میں سر دیئے سوتا تھا' سویا رہا.... حالت خواب مجھ پر طاری تھی طاری رہی..... بہت ہاتھ پاؤں مارے بڑا سر پٹخا..... مگر میں اندھیرے کا اسیر گویا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں' پاؤں میں بیڑیاں پہنے بیٹھا رہا۔

حالت خواب تو حالت جبر ہے.... کہ اس حالت جبر سے کوئی ہاتھ بڑھا کے نکالے تو نکالے' خود میں اتنی سکت کہاں..... تو میں حالت جبر میں تھا اور کچھ بھی میرے اختیار میں نہ تھا.... میں سدھ بدھ بسرا گیا.... سب بھول بھال گیا.... کہ کون ہوں کہاں ہوں... کہ اچانک کہیں سے ایک روشنی کی کرن آئی تو انکشاف ہوا کہ میں ایک غریب الدیار .... شہر میں ایسا اجنبی جو اپنے حال' ماضی اور مستقبل سے ناآشنا.... مگر پاؤں کی تھکن کہتی کہ کوئی سفر تو تھا جسے طے کر کے یہاں پہنچا.... تو وہ مسافتیں کیا مسافتیں تھیں.... وہ راستے کیا راستے تھے.... وہ منزلیں کہاں ہیں اور میں کہاں ہوں' وہی کہ جو سفر کا باعث تھیں.... میں ملگجے اندھیرے سے پوچھتا ہوں..... میں کون ہوں.... میں کہاں ہوں.... تو آوازوں کی چنگاریاں اڑتی ہیں.... جھلملاتی ہیں اور راکھ بن بن کے بکھرتی چلتی جاتی ہیں.... کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

میں اپنے ہونے کا ثبوت مانگتا ہوں مگر روشنی کی وہ ایک کرن کہ جو تھی.... وہ بھی کہیں روپوش ہوتی ہے.... کہیں لوٹ جاتی ہے اب چاروں طرف اندھیرا اور آوازوں کی چنگاریاں....

روشنی پھر ہوتی ہے مگر کرنیں ایسی چکا چوند بھرتی ہیں کہ آنکھوں کی پتلیاں لرزتی ہیں اور کچھ بھی دیکھنے سے ڈرتی ہیں۔ میں آنکھوں پر ہاتھ دھرتا ہوں.... جب خود کو دیکھنے کے قابل پاتا ہوں تو ہاتھ اٹھاتا ہوں مگر اس وقت تک آوازیں اپنی صورت سمیٹ کر کہیں گوشہ گیر ہو چکی ہوتی ہیں.... میں خود کو جب ایک بار پھر تنہا پاتا ہوں تو پھر سے اپنے قدم اٹھاتا ہوں..... اور آواز لگاتا جاتا ہوں "میں کہاں ہوں.... میں کن کے درمیان ہوں..." کہ اتنے میں کوئی مجھ سے آٹکراتا ہے۔ پہلے تو مجھے گراتا ہے پھر مجھ گرے ہوئے کو اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے مگر میرے زخم نہیں گنتا اور اپنے زخم دکھاتا چلا جاتا ہے.... میں اسکے زخموں پر ہاتھ رکھتا ہوں اور اپنے دکھتے بدن پر سسکاری بھرتا ہوں.... جب وہ خطاب نہیں کرتا تو میں آغاز کرتا ہوں۔

"اجنبی..... سنو میں اجنبی ہوں...."

وہ لب کھولتا ہے.... "کون اجنبی نہیں ہے"

"میرا مطلب ہے میں اس شہر سے آشنا نہیں مجھے کوئی راستہ دکھاؤ۔"

"میں اس شہر سے آشنا ہوں، مگر راستہ نہیں دکھا سکتا کہ دیکھنے کا تعلق تو روشنی سے ہے وہ کہاں سے لاؤں...." ہاں وہ روشنی کہاں سے لاتا کہ وہ تو ایک بار پھر ہماری دسترس سے باہر تھی اور ہر طرف اندھیرا تھا..... میں اس سے کہتا ہوں "جو جانتے ہو.... وہ تو کہو" وہ جواب دیتا ہے "جو جانتا ہوں وہی تو نہیں کہہ سکتا...."

"تو پھر یہاں سے آشنائی کا دعویٰ کیوں کرتے ہو...."

وہ اپنی دکھتی رگ سے میرا ہاتھ ہٹاتا ہے اور چڑ کر کہتا ہے۔

"کوئی شک نہیں میرے دعوے میں کہ میں آشنا ہوں اس شہر کی ایک ایک گلی، ایک ایک کونے سے، سناٹا بھی دیکھا ہے، آوازیں بھی سنی ہیں.... وہ دیکھا ہے کہ دیکھے کا یقین نہیں.... ڈرتا ہوں کہ تم سنو گے تو کیا یقین کرو گے.... عزیز اس کی گلیوں سے گذرو گے تو پل پل ٹکراؤ گے اور ہر پل ٹھوکر کھاؤ گے.... ایسا سناٹا کہ خود اپنے قدموں کی چاپ سنتا ہوں اور

ہول کھاتا ہوں.... ایسا شور.....''

''ہاں میں نے سنا ہے وہ شور..... ایسا شور....''

''مت کاٹو میری بات اور اب غور سے سنو... کہ تم نے بہت سنا ہو گا اور میں نے بہت دیکھا ہے... اندھوں کو دیکھا کہ ٹھوکر نہیں کھاتے..... بہروں کو دیکھا کہ سب سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں.... گونگے بھی دیکھے کہ لب نہیں کھولتے مگر بولتے ہیں... اور ایسے ایسے جغادری کہ قتل ہو جاتے ہیں مگر مرتے نہیں.... دیکھنے اور سننے کا فرق جانو تو آگے کچھ کہوں....

کہوں اس پہلے روز کا قصہ جب سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اچانک مجھ پر منکشف ہوتا ہے جیسا کہ تم پر آج ہوا.... کہ میں کوئی ایسا اجنبی ہوں کہ جسے یہاں کوئی نہیں جانتا..... کوئی نہیں جانتا مجھے اور میرے جاننے والوں کو کہ میں ان سب میں الگ' سب سے جدا ہوں.... سوچتا ہوں کون ایسی جگہ ہے جہاں کا کہ میں باسی ہوں اور کون ایسی مسافتیں ہیں کہ جنہیں طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں جیسا کہ تم بھی کہتے ہو.... نہ کسی کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک ہی پائی' نہ چہروں کے خدوخال ہی پہچانے گئے۔ میں بلند آواز میں پوچھتا ہوں....'' کیا کوئی مجھے جانتا ہے۔ صدا آتی ہے ''نہیں... نہیں ہم تجھے نہیں جانتے.....'' پھر ان آوازوں سے فضا بھرتی چلی جاتی ہے.... میں صدا لگاتا جاتا ہوں اور ٹھوکریں کھاتا جاتا ہوں۔

تو ہم سفر میں تھے کہ وہ رات عجب انداز میں ہمارے سروں پر مسلط ہوئی..... ہمیں سحر کا کھوج لگانا تھا کہ رات پل پل ڈھلتی تھی.... مگر آسمان بدستور تاریکی میں ڈوبا تھا.... روشنی کہیں نام کو نہ تھی..... عرصہ گذرا' بارے کہیں آسمان پہ کرنیں ہویدا ہوئیں تو گمان گزرا کہ سپیدۂ سحر ہوا.... مگر پھر کھلا کہ یہ تو محض وہم ہے اور جب انتظار نے طول کھینچا تو وہم پھیلنے لگا اور گمان سمٹتا گیا تو تب لوگوں نے لمبی تان کر سونے میں عافیت جانی اور سر نیوڑا گھروں کو چلے.... تو میں گھر کی سمت روانہ تھا کہ اندھیرے میں اچانک ہلچل مچی' کرنوں کی پھڑپھڑاہٹ چمکی تو میں نے چونک کر آسمان کو دیکھا کہ اچانک مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا اور میں نے سر تھام لیا کہ سورج تو سوا نیزے پر تھا..... یہ سفر کیسا تھا جو وہ آسمان کے وسط تک اندھیرے میں طے کر

آیا تھا.... میں نے پلٹنا چاہا مگر وہ جو سوا نیزے پر تھا جسم جھلساتا تھا اور آگ لگاتا تھا.... سو گھر کی طرف میں نے قدم تیز کئے کہ اگر میسر ہو تو گھروں کا سایہ بڑا غنیمت ہے۔

مگر اس وقت.... عین اس وقت جب گھر کی دہلیز قدم چھونے کو مچلتی دکھائی پڑتی تھی۔ کچھ ایسا ہوا کہ سورج کھڑے کھڑے گہنلا گیا.... اور ہر سو اندھیرا چھا گیا.... اب میں تھا اور اندھیرے کا سمندر.... میں نے سوچا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے... کبھی یوں بھی ہوا کہ شام سے پہلے ہی کہیں آسمان کے بیچوں بیچ دوپہر کا عالم رات کے پچھلے پہر کی صورت دھار لے، جیسا کہ تم بھی سوچتے ہو.... تو میں اندھیرے میں تھا.... مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.... میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا.... مگر صحیح سمت کا اندازہ نہ کر سکا اور بھٹکنے لگا کہ اتنے میں سورج پھر چمکنے لگا اور میں نے خود کو اپنے گھر سے پرے کسی اور دروازے پر کھڑا دیکھا.... حیران ہوا اور واپسی کا قصد کیا کہ سورج پھر بجھا.... میں اندھوں کی طرف چلنے لگا.... چلتا رہا.... اور سورج بجھتا رہا جلتا رہا.... تو اب یہی آنکھ مچولی تھی کہ اپنا دروازہ دیکھتا ہوں تو آگے بڑھتا ہوں کہ اچانک تاریکی چھا جاتی ہے.... ٹٹول کر دستک دیتا ہوں... روشنی ہوتی ہے کسی اور کے دروازے پہ کھڑا ہوتا ہوں، کسی اور چہرے پر نظر پڑتی ہے.... پلٹ کے آتا ہوں پھر تاریکی میں ڈوب جاتا ہوں.... اور یوں آنے جانے میں تم جانو میں کتنا وقت گنواتا ہوں اور ہر دروازہ بند پاتا ہوں.... تو کھلتا ہے کہ میں شہر کی ایسی گلیوں میں گم ہوں جہاں کوئی مجھے نہیں جانتا.... اور جس کسی سے کہتا ہوں میں تجھے جانتا ہوں وہ میری بات پہ ہنستا ہے، نہیں مانتا۔

سو یوں تھا کہ جس کا ہاتھ اندھیرے میں کسی سے چھوٹا اجالے میں کسی اور کے ہاتھ میں تھا.... تو میں کسی ہاتھ کو ٹٹولتا تھا جو مجھے تھامے... مگر اجنبی گلیوں میں ہاتھ کو ہاتھ ہی تو سجھائی نہیں دیتا تھا.... جب گھر کا راستہ گم ہوا تو نفسا نفسی کے اس عالم میں میں نے صدائیں لگائیں اور ٹھوکریں کھائیں کہ ہر لب پہ بس ایک ہی جواب دھرا تھا "نہیں ہم تجھے نہیں جانتے" سو میں پشیمان ہوا اور پریشان ہوا.... اب میری التجا یہ تھی کہ کوئی ہے جو ازراہ ہمدردی ہی مجھے اپنے ساتھ لیتا چلے.... مگر میری یہ بات اس صبح کی مانند تھی کہ جو ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے،

سو کون ایسا تھا جو آگے بڑھتا... نہیں کوئی نہیں تھا...

ہاں تو جب کوئی اپنے پیچھے نہ آنے دے تو خود اپنے پیچھے چلنا پڑتا ہے... سو میں نے سورج کی طرف سے منہ پھیرا اور اپنے پیچھے چلا کہ اب میرا سایہ ہی میرے آگے تھا... مگر اس شہر میں جہاں سورج پل پل جلتا پل پل بجھتا تھا، اندھیرے نے مجھ سے میرا سایہ بھی جدا کیا... مجھے تنہا کیا تو اب کوئی راستہ نہ تھا کہ میں ایک بار پھر اندھیرے میں بیٹھا روتا تھا اور خود سے کہتا تھا کہ یہاں نہ ملا کوئی بھی ایسا کہ جو بن مول ہی خریدتا..... نہ چڑھاتا مجھے اپنے کندھوں پر، میرے ہی کاندھوں پہ اپنا بوجھ لادتا..... نہ ملا کوئی نہ ملا..... یہ کہا اور حیران ہوا کہ بارے میری یہ بات سنی گئی۔ جی ہاں سنی گئی کہ جانے اس میں کیا مصلحت تھی کہ ایک بھلے مانس نے میری اس بات پہ خوشی و مسرت کا اظہار کیا... سنتے ہو خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا.... اپنا بوجھ میرے کاندھوں پہ لاد دیا اور کہا کہ چلے آؤ میرے پیچھے پیچھے کہ ابھی سے تم کام پر ہو.... اور تمہارا کام یہ ہے کہ تم فقط میرے سائے پہ نظر رکھو کہ کہیں وہ مجھ سے آگے نہ نکل جائے۔ تو مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس سے کہا "بھلے مانس" سورج کی طرف چلو گے تو سایہ تمہارے پیچھے رہے گا اور رخ پھیرو گے تو وہ آگے نکل جائے گا، اتنا دھیان تو تمہیں بھی ہو گا...." "تمہارا کام میری باتوں کو سننا اور عمل کرنا ہے" اس کا جواب تھا "دخل دینا نہیں...." سو کچھ بھی دخل نہ تھا مجھے سیاہ و سفید میں..... اور میں نے ویسا ہی عمل کرنے کی ٹھانی کہ جیسا اس نے مجھ سے کہا..... اور جب روشنی ہوئی تو ہم نے اپنا اپنا کام شروع کیا مگر جاری نہ رکھ سکے کہ سورج ایک بار پھر ڈھلے بغیر بجھ گیا اور ہم اندھیرے میں گھر گئے مگر چلتے رہے کہ وہ عجلت میں تھا.... ہم عجلت میں تھے مگر رات عجلت میں نہ تھی، وہ اپنی رفتار سے چلی.... سو سورج ایک بار پھر جلا تو منکشف ہوا کہ جس شخص نے مجھے بن مول لیا تھا میں اس کی بجائے کسی اور کے پیچھے چلا جا رہا تھا....

سن بھی رہے ہو یا نہیں.....

(میں نے اس کا ہاتھ اور مضبوطی سے تھاما)

ہاں تو پھر ایسا ہوتا رہا کہ روشنی جب جب جلتی جب جب بجھتی میرے آگے چلنے والے بھی بدلتے کسی اور شکل میں ڈھلتے.... سو میں ہر بار ایک نئی سمت رواں تھا کہ میری تو پہلے ہی کوئی سمت نہ تھی مگر میرے آگے چلنے والوں کا بھی کوئی آگا تھا نہ پیچھا تھا.... یوں لگتا... جیسے کوئی ایک ہی شخص ہر بار صورت بدل کے آتا ہے اور ایک نئی سمت کو لے جاتا ہے.... اور ہر بار ایک نئی داستان سناتا ہے.... سب کو شناسائی کا دعویٰ... مگر سب اجنبی.... کسی کا کوئی گھر نہیں دروازہ نہیں.... منزل نہیں راستہ نہیں... سو سب اجنبی تھے....

تو اجنبی! میں بہت دن سے اجنبیوں کے درمیان ہوں... کہ یہ میرا مقسوم تھا جیسا کہ اب تمہارا بھی ہے.... مجھے دوسرے کے پیچھے چلنا تھا' چلتا رہا کہ اب تم میرے پیچھے چلتے ہو..... میرا اپنا کوئی گھر نہ تھا راستہ نہ تھا... سو مجھے منزلوں سے واسطہ نہ تھا.... کبھی ایک کا ہاتھ تھاما کبھی دوسرے کا..... دل ہر چند پشیمانی سے ہاتھ ملتا رہا....

وہ چپ ہوا اور آہ بھری تو میں نے یاد دلایا۔

مگر تمہیں دعویٰ ہے یہاں سے آشنائی کا.... مجھے راستہ دکھاؤ....

وہ تو ہے مگر راستہ نہیں دکھا سکتا کہ راستے کا تعلق تو روشنی سے ہے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ کہ کسی نے ہمارے گرد دیواروں کا حصار کھینچ رکھا ہے اور اوپر بہت اوپر چھت تان دی ہے۔ کہیں درمیان میں اس چھت کے اندر ایک روزن ہے جس کے کواڑ ہواؤں سے کھلتے ہیں.... جب کھلتے ہیں روشنی ہوتی ہے۔ جب نہیں کھلتے اندھیرا رہتا ہے... وہی روزن بس وہی روزن تو روشنی کا ذریعہ ہے باہر کا راستہ ہے.... جو ہماری پہنچ سے باہر ہے....

سب پہنچ میں ہیں کیا زمین' کیا آسمان... میں نے جھنجلا کے کہا....

تو وہ ہنسا... ہم حالت جبر میں ہیں اور ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔

مجھے طیش نے بے حال کیا تو اٹھا.... آسمان کی طرف دیکھا اور اس روزن تک پہنچنے اور باہر نکلنے کی سعی کرنے لگا.... بہت دیر اس کوشش میں صرف ہوئی۔ پھر جیسے کسی نے خود ہی میری ہتھکڑیاں کاٹ دیں.... بیڑیاں اتار دیں... تو حالت جبر سے چھٹکارا ملا.... خواب سے

سن تو سہی

وہ بوڑھا اپاہج' راکھ کا ڈھیر عمر کا پچھتاوا گلی گلی سے گذرتا ہے اور بند دروازوں پہ دستک کرتا ہے...... "سنو! تمہیں کوئی کام نہیں تو سنو...... کہ میں کہانی کہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ مجھے کوئی کام نہیں۔ میں تمہاری داستان بیان کرتا ہوں ان لمحوں کی داستان کہ جو تم پر بیت رہے ہیں کہ جو تم سے پہلوں پر بیت چکے۔ میں سناتا ہوں ان گلیوں کے فسانے کہ جو شاید کہیں ہیں...... یہیں ہیں۔"

کوئی کیا سنے۔ روشن دان کھلے ہیں جن سے جھانکا جا سکتا ہے نکلا نہیں جا سکتا کہ گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں تو بند ہیں۔ آسمان کے بیچوں بیچ سورج ہے درختوں کی شاخوں پہ پتے نہیں۔ ہوا چلتی ہے مگر لو کا عالم ہے۔ ہو کا عالم ہے..... اندر رہنا ممکن نہیں باہر نکلنا بھی دشوار ہے۔ کوئی کیا نکلے' کوئی کیا دیکھے' کوئی کیا سنے۔

مگر مجھے کچھ کہنا ہے۔ سن اے مسافر تو ہی سن۔ تیرے اس مشکی گھوڑے کی خیر۔ تیری اس چمکتی زین کی خیر۔ تیری تلوار کا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہو گا۔ بہت خوشنما ہے بہت دیدہ زیب ہے۔ تو مجھے بادشاہ لگتا ہے کوئی شہزادہ لگتا ہے...... تیرے ان مصاحبوں کی خیر۔ مگر یہ تو بتا تو جو اس چوک میں بہت دیر سے ا-ستادہ ہے کیا تجھے دھوپ نہیں لگتی۔ تیرا پسینہ کیوں نہیں بہتا۔ تیرا گھوڑا چلنے سے کیوں عاری ہے۔ تیری آنکھیں کیوں پتھرائی ہیں۔ اور یہ تیرے گھوڑے کے پیچھے کون بندھا ہے۔ یہ جو زمین پہ پڑا ہے۔ خاک سے لگا ہے۔ سن میں تجھے اک حکایت سناؤں کہ پہلے بھی یہ منظر میں نے دیکھا ہے ہاں میں نے دیکھا ہے گھوڑے پہ

نجات ہوئی.... تو میں نے دیکھا کہ اوپر چھت نہیں روزن نہیں.... آسمان ہے اور بادل.... وقفے وقفے سے بجلی چمکتی ہے، کہیں گرتی ہے کسی کو راکھ کرتی ہے.... میں شہر کی گلیوں میں آوارہ گھومتے گھومتے کسی گھر کی دہلیز کے آگے پاؤں پسارے سوتا ہوں....

حیران ہوتا ہوں.... پھر دھیان آتا ہے گرج چمک نے میری آنکھ کھولی.... میں اٹھتا ہوں.... اس کی لال ٹین اٹھاتا ہوں اور گری ہوئی لاٹھی سنبھال ہنکارے بھرنے لگتا ہوں.... جاگتے رہو.... جاگتے رہو.... مگر وہ نہیں جاگتا.... وہ کہ جس کی یہ لاٹھی اور لال ٹین ہے۔

(سیپ)

شہسواروں کو اور خاک میں لتھڑے ہوئے گہنگاروں کو..... یہ جو چاروں طرف سناٹا ہے۔ ایسا سناٹا بھی دیکھا ہے۔ بغاوتیں بھی دیکھی ہیں اور بغاوتوں میں پسپا ہوتے لوگوں کو بھی دیکھا ہے۔ دیکھا ہے ہاں اسی طرح لوگوں کو مکانوں میں بند دیکھا ہے۔ دیکھا ہے اس بستی کا حال جہاں بڑوں کے کہنے کے مطابق لوگ مدتوں سے بغاوت کرتے آئے تھے مگر پھر کیا ہوا.... بس ایسا ہی ہوا جیسا آج ہے.... شہسواروں کے مجسمے بنے اور باغیوں کے لئے زنداں خانے..... ان کے گھر ان کے لئے زندان مقرر ہوئے...... تو ایسا کیوں ہوا؟..... مگر ہوتا کیوں نہیں ہونا تو تھا۔ بغاوت نہ ہو تو نئے عہد کا آغاز نہیں ہوتا۔ سو نئے عہد کے آغاز کی خواہش انہیں مدتوں سے سرداروں کے خلاف اکساتی آئی تھی۔ سو ہو گیا تھا۔

کسی کو کچھ ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ بغاوتوں کا آغاز کیسے اور کیوں ہوا تھا۔ "سردار تم ہی سردار کیوں ہو؟" اور جواب سردار کی ننگی تلوار نے دیا تھا۔ اتنا ترکی بہ ترکی، اتنا برجستہ کہ درباری دیر تک عش عش کرتے رہے۔

وہ دن گذرا۔ پھر صدیاں گذریں جب لوگوں کو فکر دامنگیر ہوئی کہ آخر وہ لوٹا کیوں نہیں جو لوٹ آنے کو کہہ گیا تھا۔ جو دربار میں گیا تھا جواب مانگنے.... یہ سوچتے ہی ان کے سروں میں پھر سودا سمایا سو ایک ریلا آیا اور دربار کی چوکھٹ پار کر کے سردار کے آگے ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

تو سن...... سردار پہلے تو یہ دیکھ کر چیں بہ چیں ہوا پھر لوگوں کے تیور دیکھ کر تیورایا...... سنبھلا...... مسکرایا۔ مصاحبوں نے جانا کہ سردار پھر کوئی تدبیر لایا "تم مجھ سے پوچھتے ہو، میں سردار کیوں ہوں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم ایسے کیوں نہیں جیسا کہ میں ہوں۔ چونکہ تم ان دونوں باتوں سے آگاہ نہیں تو سنو میں سردار ہوں مگر اس میں میری مرضی، میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔ مجھے جیسا ہونا چاہئے تھا میں ویسا ہوں۔ تمہیں جیسا ہونا چاہیے تھا تم ویسے ہو آخر اس میں جھگڑا کیا ہے؟"

"ہمیں ایسا کیوں ہونا چاہیے تھا جیسے ہم ہیں۔" کسی نے سردار کی دانست میں ایک

احمقانہ سوال کیا تھا۔

"لوگو ہم حالت جبر میں ہیں اور ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں ہم ایک دوسرے سے مختلف رہیں گے' تم ایک دوسرے سے مختلف ہو' تم ایک دوسرے سے مختلف رہو گے۔ اب یہی دیکھو میری نیام میں تلوار ہے اور تمہارے پاس تلوار کا تو کیا مذکور نیام ہی نہیں۔"

لوگوں نے یہ سنا اور سر جھکا کر لوٹ گئے۔ اب وہ ایک دوسرے سے ملتے تو یہ کہہ کر جدا ہو جاتے کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ کتنے جدا ہیں۔ ہاں تو یوں انہوں نے اپنے رنگ جدا کئے' اپنے ڈھنگ جدا کئے اور ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔

مگر ایسا لگتا تھا کہ ان میں سے بھی وہ کہ جو ان سے بھی مختلف ان سے بھی جدا تھے نچلا نہ بیٹھ سکے اور ایک دفعہ پھر سردار کے گرد ہوئے۔ گویا وہ بھید پا گئے ہوں اب ان کے نیام بھی تھی اور تلوار بھی۔

"کیوں سردار اب کیا کہتے ہو۔ اب یہاں کتنے ہی اپنی نیاموں میں تلوار لئے پھرتے ہیں۔ اب کہو......"

سردار نے یہ سن کر نیام سے تلوار جدا کی۔ مگر پھر ہجوم میں سروں کو گنا اور نیاموں سے جھانکتی ہوئی تلواروں پر نظر کی اور دستے سے ہاتھ اٹھالیا۔

"شاید میں تمہاری بستی کا اب آخری سردار ہوں" اس نے مایوسی سے سوچا اور لوگوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔ اور اس ساعت کا انتظار کرنے لگے جب برج الٹے گا جب سردار کی زندگی اس کا ساتھ چھوڑے گی پھر ایسا ہی ہوا کہ ایسا ہی ہونا تھا۔ مگر ویسا بھی نہ ہو سکا کہ جیسا ہونا چاہیے تھا۔ تب لوگوں نے بغاوت کی اور اسے بھاگتے ہی بنی۔ تو جب اس کا محاصرہ ہوا تو سانس اسکی پھول رہی مگر آنکھوں میں چمک اب بھی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے ہاتھ اٹھائے آسمان پر نظر کی اور قرب قیامت کی نشانیاں بتانے لگا۔ لوگوں نے سنا۔ بوکھلائے اور بغاوت سے باز آئے کہ قیامت برحق ہے اس نے کہا "میں تمہارے قبیلے کا

آخری سردار ہوں اور تم اس قبیلے کے آخری افراد ہو۔ نہ میرے بعد آگے کچھ ہے، نہ تمہارے بعد آگے کچھ ہو گا۔ جب میں نہ رہونگا، تم بھی نہ رہو گے۔ تب یہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے۔ دریا اپنا راستہ بدل دے گا اور تمہاری بستی بھک سے فضا میں اڑ جائے گی۔ سو کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا تھا ''اب آگے اس کا تمہیں اختیار ہے مگر اتنا یاد رہے کہ تمہاری زندگیاں میری زندگی کے ساتھ وابستہ کر دی گئی ہیں......''

لوگوں نے سنا اور ششدر ہو گئے بارے کہیں دیر بعد جب محویت کا عالم ٹوٹا تو چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ یہ منظر دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تب اس نے گھوڑے کو ایڑھ لگانا چاہی کہ اس شخص نے جو باغیوں کا سرخیل تھا آگے بڑھ کر لگام تھام لی وہ یوں اپنی ساری محنت اکارت جاتے کیسے دیکھ سکتا تھا۔

''سردار تمہارے باپ نے بھی یہی کہا تھا کہ میں تمہارے قبیلے کا آخری سردار ہوں۔''

''لیکن اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اس قبیلے کے آخری افراد ہو اور نہ ہی یہ کہ جب تک میں زندہ ہوں تم بھی زندہ رہو گے۔'' سردار نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔

تو یہ سن کر لوگ بری طرح خوفزدہ ہوئے تھے اور سرخیل کو گریباں سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا گیا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے چاہے ان کی زندگیاں سردار کے ساتھ ہی کیوں نہ وابستہ کر دی گئی ہوں۔ بہت کم ''ہاں'' اور ''نہیں'' کی کشمکش میں مقید ہوئے۔ سو سرخیل نے ایک کوشش اور کی کچھ آگ سلگی کچھ بھڑکی۔

یہ دیکھ سردار نے دوسرا پانسہ پھینکا ''تاج و تخت میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی میں تم سے اپنی جان کی بھیک مانگتا ہوں۔ میں نے تمہارے بھلے کی خاطر اپنی جان کی حفاظت کی ہے تاکہ تم......'' سردار کی انگشت شہادت ہم سب کا احاطہ کرتی تھی ''تاکہ تم زندہ رہ سکو۔'' اس نے یہ کہا اور سرخیل کے دائیں بائیں لوگ بکھرنے لگے تھے تب سردار نے رسہ پھینکا اور ان باغیوں کے سرخیل کو گھوڑے کے پیچھے گھسیٹتا ہوا ساتھ لے چلا۔ اور لوگ اس کے پیچھے سر جھکائے واپس لوٹ آئے اور گھروں میں بند ہو گئے۔

وہ لوٹ تو آئے مگر اس نئے خوف کے ساتھ کہ سردار کی بشارت ان کے سامنے تھی اب ان کی زندگیاں سردار کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھیں سو لازم تھا کہ وہ اس کی حفاظت پر مامور ہوں جو خود ان کی اپنی حفاظت تھی۔ سو وہ اپنی حالت سے بے خبر اس کی زندگی کا حصار بن گئے یہی ان کے حق میں بہتر تھا اور یہی ان کو بتایا گیا تھا۔

وقت چلتا رہا کہ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ وہ بھی بچے تھے جوان ہو گئے اور جوانوں کو بڑھاپا چاٹنے لگا۔ ایسے میں بھلا سردار کی کمر کیوں نہ جھکتی مگر لوگوں کو وقت گزرنے کا احساس ہی کب تھا وہ تو ایک ہی ادھیڑ بن میں مصروف تھے اطلاع تو خود سردار نے دی۔

"لوگو میں بوڑھا ہو چکا ہوں' اور جانتے ہو بڑھاپے کے بعد زندگی کی کوئی منزل نہیں شاید ہم کل کا سورج نہ دیکھ سکیں۔"

شاید ہم کل کا سورج نہ دیکھیں۔ لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی تھا وہ خوف سے وحشت کی منزل میں داخل ہو گئے اب انہیں کسی نئی بشارت کی ضرورت تھی مگر ان میں وہ بھی تھے جو سب سے مختلف' سب سے جدا ہوتے ہیں۔ انہیں خواہش تھی کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں' دریا راستہ بدل دے اور بستی بھک سے فضا میں اڑ جائے مگر ویسا ہو جائے کہ جیسا ابھی تک نہیں ہوا۔

سو ویسا ہوا کہ جیسا ہونا تھا مگر ویسا نہ ہوا کہ جیسا ہونا چاہئے تھے' اگلے دن صبح بھی ہوئی اور سورج بھی نکلا ہر چند کہ سردار مر چکا تھا۔ لوگ اس کے جنازے کے گرد کھڑے اپنے ہونے پر گمان کر رہے تھے کہ کسی صدا نے انہیں چونکایا وہ کہہ رہا تھا۔

"اب آگے اس کا تمہیں اختیار ہے مگر اتنا یاد رہے کہ میرے باپ نے تمہاری زندگیاں میری زندگی کے ساتھ وابستہ کر دی ہیں تاکہ تم...... تاکہ تم زندہ رہ سکو۔"

لوگوں نے یہ سنا اور ششدر ہوئے۔ اور پھر اتنا ششدر ہوئے کہ دیوانوں کی طرح گریباں چاک کر لئے اور چلاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا

اور اب تک انہیں ڈھونڈ تا ہوں۔ بوڑھے نے حکایت ختم کی کچھ توقف کیا پھر اس شخص پہ نظر کی کہ جسے وہ حکایت سنا رہا تھا اور حیران ہوا اور تاسف سے خود کو کہنے لگا۔ بوڑھے تم بھی سٹھیا گئے ہو۔ یہ تو اک مجسمہ تھا پیتل 'لوہے یا مٹی کا بنا ہوا شاید صدیوں سے یہاں ا ستادہ ہے آہ تو نے یونہی وقت ضائع کیا۔ وہ اٹھا اور اٹھ کے پھر بند مکانوں پہ دستک کرنے لگا لیکن چاروں طرف ایک ہی صدا تھی "مگر باہر دھوپ بہت ہے' لو چلتی ہے۔ دھوپ ڈھلنے دو ہوا چلنے دو تم کہنا' ہم سنیں گے۔"

(گواہی)

کانچ کا شہر، شیشے کی گلیاں

کانچ کا شہر

شیشے کا مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔ پانی سے بھرا ہوا جس میں پھولوں کی پتیاں ہمہ وقت مہکتی رہتیں۔ ہم ایک چھوٹے سے بوسیدہ سے گھر میں رہتے تھے۔ وہ میرا بچپن تھا۔ جب میں کوئی خواہش کرتا تو میرا باپ کڑھنے لگتا مگر میری ماں مسکراتی اور مجھے کہتی جب تم کوئی خواہش کرو اور جب تم کوئی خواب دیکھو' کوئی پھول کہیں سے توڑ کے لاؤ اور اس میں ڈال دو پھر اس کے شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھو اندر ایک ایسا شہر سا بنا دکھائی دے گا جیسا تم نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا' بالکل ان کھلونوں جیسا کہ جن کی تم خواہش کرتے ہو۔ ہم نے عمر بھر یہی کیا۔ نسل در نسل اس کی حفاظت کی یہ پھول صدیوں سے ہمارے پاس محفوظ ہیں کچھ تم بھی ڈالو۔

نسل در نسل پھول مہکتے کیسے رہتے ہیں۔ تعفن کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اب سوچتا ہوں۔
تب اندر اک شہر دیکھتا تھا بالکل اپنی ماں کے خوابوں جیسا.....!

صبح ہوتی اور جب سارے لوگ کام کاج کو نکل جاتے' تب میری ماں اپنی گود میں کچھ تازہ پھول بھرتی اور رات کا دیکھا خواب بیان کرتی..... وہ روز ایک ہی خواب دیکھا کرتی تھی..... ایک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے' لوگ پھولوں کی مانند کہ مہکتے تھے' دریاؤں میں شہد اور دودھ بہتا تھا بادل روئی کے گالے...... بس کچھ ایسا ہی تھا' ایسا ہی رہا ہو گا..... اب پورا کسے یاد.....!

وہ پھول تھے کہ خواب..... خواب تھے کہ خواہشیں..... اک شہر کہ میری نگاہوں میں

رہتا۔ مگر ان دنوں وہ میرے خوابوں میں نہیں جاگتا تھا اور رات بیت جاتی' اس کے سوا معلوم نہیں اور کیا کیا آنکھوں کے پیچھے پرچھائیں کی طرح گذر جاتا' عمر ہی ایسی تھی۔ البتہ دن میں اس مرتبان کے پھول وہی ایک خواب بن کر مہکتے رہتے۔ پھر یوں ہوا کہ صرف مہک رہ گئی۔ مہک بھی کیا مرجھائے ہوئے پھولوں کی باس کہ میری عمر آگے کو سفر کرتی تھی اور میری ماں کی پیچھے کی طرف۔

برس بیت گئے اب نہ وہ گھر رہا' نہ وہ افراد' سب تتر بتر ہو گیا۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لفظ چنتا' چہرے دیکھتا بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے اندر باہر مختلف صورتیں دھارتا ادھر سے ادھر ہو گیا..... کہ درمیان میں ایسی عمر پڑی کہ جب راتیں اور دن آپس میں گڈمڈ ہو جایا کرتے ہیں۔ خواب اور حقیقت میں فرق نہیں رہتا۔ کبھی خواب حقیقت لگتا ہے اور کبھی حقیقت خواب..... عمر کی اس راہداری میں اپنی آواز کی بازگشت میں بھی بڑی گونج اور دبدبہ ہوتا ہے۔ یہ لڑکپن کے دن ہوتے ہیں..... میں جوانی کی دہلیز پہ تھا۔

جوانی کی دہلیز پہ جب کبھی کبھار گئے دنوں کے نقوش سے گرد اڑتی تو خیال پیدا ہوتا کہ شاید مجھے کسی خوابوں کے شہر کی طرف سفر کرنا تھا۔ مگر کدھر؟ کس سمت؟ اور انہی دنوں میں نے ایک روز گلیوں اور سڑکوں پہ ہجوم دیکھے کہ جو اسی الجھن میں تھے۔

اس رات میں نے اک خواب دیکھا۔ اک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے تھے..... اور اک خواب کہ سب کچھ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

اگلے روز میں نے وہ خواب جس سے بیان کیا وہ پریشان ہوا اور اپنی راہ لی۔ اس دن مجھے گئے دن یاد آئے اور میں نے گھر میں اس شیشے کے مرتبان کو تلاش کیا کہ جس میں کائی جمی تھی اور وہ متعفن ہوا تھا۔ میں نے اسے صاف کیا اندر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھیریں اور اسے پانی سے بھر دیا۔ اب سوچتا ہوں ایسا کیوں کیا۔ میری ماں کی خواہشیں خواب تھیں سو وہ پھول ڈالتی تھی اور پانی بھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور مہکتے رہیں..... میرے خدشے خواب ہیں..... مجھے خواہشوں کے خواب کیوں نہیں آتے میں ہر رات تمنا سے سوتا رہا مگر وہی ایک خواب وہی ایک خدشہ.....

پھر ایک رات دیکھا.....

وہی ایک شہر کہ زمین و آسمان جس کے کانچ ایسے' پھر دیکھا کہ کچھ نوعمر ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے آسمان کو نشانہ کرتے ہیں پتھر زناٹے بھرتے جاتے ہیں چھناکے کی آواز آتی ہے جیسے کرچی کرچی..... پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہاتھوں میں بڑے بڑے ستون اٹھائے بھاگے آتے ہیں اور انہیں آسمان کے نیچے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے بچا رہے....

میں اپنی بیوی سے اپنا خواب بیان کرتا ہوں...... وہ اپنی خواہش مجھ سے کہتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کی انگلی تھامے گلی میں آتا ہوں..... گلی میں ہجوم ہے ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے..... میں آسمان کی سمت دیکھتا ہوں اک خوف کہ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

وہی دن بھلے تھے جب صرف خواہشیں تھیں خدشے نہ تھے۔ میں کہتا ہوں اور میری بیوی کہتی ہے "تمہارے وہ دن بھی بھلے نہ تھے' تمہارے یہ دن بھی بھلے نہیں۔"

میں شیشے کے مرتبان میں دیکھتا ہوں وہ شہر کہیں بھی نہیں جو میری ماں کی آنکھوں سے آشکار تھا اور جسے اس نے نسل در نسل دیکھا۔

ہم کس شہر میں رہتے ہیں اور وہ شہر کہاں ہے.....؟ میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے میں اس سے کہتا ہوں اک پھول لاؤ اور اس شیشے کے مرتبان میں ڈالو..... مگر اسے وہاں کوئی شہر دکھائی نہیں دیتا۔

وہ دن اچھے تھے جب میں خوابوں کی خواہش کرتا تھا مگر وہ مجھ سے دور رہتے..... اب خوابوں کا تانتا بندھا ہے مگر یہ خدشے کہاں سے در آتے ہیں۔ میں اس آسیب کا کیا کروں کہ میرا بیٹا مجھ سے مختلف ہوتا جاتا ہے۔ وہ خواہشوں کو خواب نہیں بناتا۔ وہ شیشے کے مرتبان میں نہیں جھانکتا..... وہ کھڑکی سے باہر کود جاتا ہے..... کنکر پتھر اٹھا کر..... تب مجھے اپنا گھر شیشے کا لگتا ہے اور شہر اور اس کی گلیاں اور سارے گھر.....

مگر اب جب وہ لوٹتا ہے تو مٹی دھول ہوتا ہے پریشان اور خستہ حال کہ اب تو وہ ہجوم بھی اسے دکھائی نہیں دیتے کہ جو اس کے ہمراہ تھے۔ کنکر پتھر اٹھائے...... ایک صبح اس نے مجھے کہا کہ آج رات میں نے شہر کے تمام گھروں پہ تالے دیکھے..... گلیوں میں سناٹا تھا..... میں نے

بہت صدائیں دیں مگر کچھ بھی نہ تھا...... یہ لوگ کیا ہوئے۔

میں ہنسا کہ خدشے تمہاری آنکھوں میں بھی در آئے۔ میں نے بھی رات اسی طور بسر کی ہے۔ اک شہر کہ کانچ کے در و دیوار اور کچھ لوگ کہ بھاری قدموں سے زمین پہ دندناتے آتے ہیں۔ چھناکا ہوتا ہے۔ زمین شق ہوتی چلی جاتی ہے..... نیچے ایک دلدل اور شہر کہ دھنستا جاتا ہے۔ نیچے بہت نیچے..... لوگ ڈوبتے ہیں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر بے سود کہ آسمان بھی کرچی کرچی۔ کانچ کی بارش پھر..... آنکھ کھل جاتی ہے..... میں اسے آواز دیتا ہوں۔

میں کسے آواز دیتا ہوں کہ وہ اب بچہ نہیں ایک بچے کا باپ ہے۔ اک عمر درمیان میں سے کیسے نکل گئی..... یہ کیا ہوا؟

......(۲)......

سفر پہ نکلے ہوئے مسافر اپنے گھروں کے خواب دیکھتے ہیں۔ پھول ایسے چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہوں تو اندھیری راتوں میں آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر اندھیرا کروٹیں لیتا ہے مگر خواب کا منظر دوبارہ نہیں کھلتا وہ گھر سے دور اپنے ننھے بیٹے کو یاد کرتا ہے جو اس وقت بے سدھ سوتا ہو گا۔ کیا معلوم وہ اب اس کی یادوں میں شامل ہے بھی یا نہیں مگر شروع کے دنوں میں وہ مچلتا ہو گا۔ سوتے سے کسی ویرانی کا احساس بھی کرتا ہو گا۔ ان میں یارانہ بھی تو بلا کا تھا۔

شام ہوتے وہ اپنے گھر سے نکلتے' کھلے سبزہ زاروں پہ ٹہلتے' سوال و جواب کرتے' سورج چھپنے' چاند نکلنے کا اسرار جانتے۔ ننھی منی نظمیں لہک لہک کر گاتے اور واپسی کے راستے سڑکوں کے کنارے دوکانوں پر جلتی بجھتی رنگین روشنیوں کا نظارہ کرتے واپس لوٹتے اور باغیچوں سے چنے ہوئے پھول اس شیشے کے مرتبان میں ڈال دیتے کہ جو پانی سے بھرا وہ اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

شیشے کا یہ مرتبان ان قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو اس کے باپ کو بہت عزیز تھا۔

(فنون)

شیشے کی گلیاں

بچہ تھا کھیلتے ہوئے ذرا دور نکل گیا ہو گا..... مگر فکر کی کوئی بات نہ تھی لوٹ آتا۔
یہ جانتے ہوئے بھی کہ بچے عام طور پر علوم راستوں پر ہی رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔
جہاں تک انہیں آشنائی ہوتی ہے۔ وہ اس سے آگے جانے میں کتراتے ہیں۔ میں البتہ فکر مند
ہو گیا تھا۔

بچے کی دیکھ بھال میری ذمہ داری نہیں۔ یہ وبال میری بیوی کا ہے اور وہ اس کا خیال
رکھنا بھی جانتی ہے۔ البتہ چھٹی کے دن یہ کام کبھی کبھی میرے سپرد بھی ہوتا ہے۔ اس روز
جب اسے کسی کام سے تنہا جانا ہو۔ پھر وہ بہت ساری ہدایات میں ایک ہدایت یہ بھی کر جاتی
ہے کہ میں اسے گلی میں نہ نکلنے دوں۔ دروازہ اندر سے بند رکھوں اور گویا اس سے کھیل کود
کر دن گزار دوں۔

خیر اس میں کچھ قباحت بھی نہیں۔ گھر کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی ممکن ہی نہیں چھٹی
والے دن بستر پر دیر تک کروٹیں لینے اور پھر دن چڑھے کسی دوست آشنا سے مل آنے یا پھر گھر
پر ہی بیٹھے کوئی کتاب رسالہ پڑھنے کے سوا مجھے کوئی اور کام بھی تو نہیں ہوتا۔

جب کوئی اور کام نہ ہو تو میں خود منتظر رہتا ہوں کہ میرے سپرد کوئی کام کیا جائے۔ سودا
سلف لانا، کھڑکیوں، دروازوں کی جھاڑ پونچھ کرنا، بچے کو بہلانا پھسلانا یا اسے لے کر سیر کو نکل
جانا۔ کبھی کبھی زندگی کو سرگرم رکھنے میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میرا چھٹی کا دن اس
سے سوا اور کس کام کا ہے؟

میری بیوی جانتی ہے کہ میرا چھٹی کا دن اور کسی کام کا نہیں۔ اسی لئے وہ میرے ہر فارغ وقت کا تعین بھی خود کرتی رہتی ہے!

ہر چند کہ میں متعین ہدایات کا پابند ہوں..... مگر معلوم نہیں کیوں بس کسی کسی دن۔ بس کسی کسی چھٹی والے دن زندگی کچھ مختلف سا چاہتی ہے۔ کوئی اپنے ڈھنگ کا کام.... بالکل ان بچوں کی طرح.... جو بچوں کے ہجوم میں کھیلتے ہیں.... کھیلتے رہتے ہیں اور پھر اچانک ان میں سے کوئی ایک کسی جگہ چھپ جاتا ہے... کسی اوٹ میں... کسی جگہ.... کسی بھی جگہ.... اور دوسرے اسے ڈھونڈتے ہیں.... ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے.... تو فکر مند ہو جاتے ہیں.... پھر وہ بہت دیر چھپا بیٹھا رہتا ہے.... آج کا دن مجھے بھی بس ایسا ہی چاہیے تھا صرف آج کا دن.... میں چھپ جانا چاہتا تھا... کہیں اور نہیں... اپنی ہی چارپائی پر... اپنے ہی لحاف کی اوٹ میں!

چھٹی کا کوئی کوئی دن ایسا ہوتا ہے' جب رات کا دیکھا ہوا خواب جاری رہنے پہ اصرار کرتا ہے جب بستر کی سلوٹوں میں بیتے ہوئے دنوں کے مرجھائے ہوئے پھول نئے سرے سے کونپلیں بن کر پھوٹتے ہیں اور بند آنکھوں میں مہکتے ہیں.... آج کا دن بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔

ایسا ہی چاہیے تھا کہ میں اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے لے کر گلی میں نکلتا.... مٹی کے گھروندے بناتا.... چڑیوں اور تتلیوں کا تعاقب کرتا.... یا کسی نوعمر لڑکے کی طرح کسی چھت پر کھڑا پتنگ بلند کرتا اور پھر اسے دور آسمان پر لہریئے کھاتا کسی انجانی منزل کو جاتے دیکھا.... نوجوانی کے جذبے ہوتے.... کوئی نرم.... رسیلا ہاتھ ہوتا.... بند آنکھوں کے خواب مہکتے میٹھے ذائقوں سے بھرے ہوئے.... بس سارا دن.... اور شام ہو جاتی!

خواب.... میٹھے ذائقوں سے بھرے ہوئے دیکھنا.... اور بس دیکھتے ہی رہنا.... اگر زندگی کا مقسوم ہو تو اس سے بھلا اور کیا ہے.... مگر ایسا ہمیشہ کب میسر ہے۔

رات جب میں کام کاج سے لوٹا تو میری بیوی نے آج کی بابت کسی پروگرام کا اعلان نہیں کیا حالانکہ اس کے ساتھ ایسا ہے کہ وہ ہمہ وقت زندگی کو ترتیب دیتی رہتی ہے۔ آج کی بابت بھی اس کے ذہن میں پہلے سے طے ہو گا۔ بس اسے خیال ہی نہیں آیا کہ کم از کم ایک

شب پہلے ہی سہی مجھے مطلع کر دیتی کہ صبح کیا کرنا ہے۔ شاید اس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس کا خیال ہو گا کہ چھٹی کا دن ہے اور مجھے وہی کرنا چاہیے جو فراغت میں وہ مجھ سے توقع کرتی ہے۔

جب اسے کہیں جانا ہو اور اس روز بچے کی نگہداشت میرے سپرد ہو تو وہ جاتے ہوئے بچے کو میرے بستر پر اتار جاتی ہے تاکہ وہ مجھ پر لوٹیں لگائے اور میں اٹھ بیٹھوں۔

اور میں اٹھ بیٹھتا ہوں اور اس کے ساتھ مصروف ہو جاتا ہوں۔ جب کسی دن بیوی گھر پر نہ ہو اور مجھے بچے کا خیال رکھنا پڑ جائے تو ابتدا میں یہ کام زیادہ دشوار نہیں ہوتا مگر رفتہ رفتہ اس میں کچھ مشکل مقام بھی آنے لگتے ہیں اور آخر آخر یہ دردِ سر بھی ہو جاتا ہے۔

بچوں اور بڑوں کے درمیان اسی وقت تک ہی معاملہ چل سکتا ہے جب تک کہ دونوں کے درمیان کوئی یکساں دلچسپی کا کھیل موجود رہے...... پھر اس کے بعد دونوں کو اپنے اپنے ہم عمروں کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ بڑوں پر بیزاری چھا جاتی ہے... بچہ باہر جانے کو مچلنے لگتا ہے۔

ہمارے بچے پر گلی میں نکلنے پر پابندی نہیں ہے مگر بہت سارے دوسرے والدین کی طرح اسے بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ زیادہ دور نہ جائے.... دروازے کے ساتھ لگ کر کھیلے۔

میرا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی مجھے تنہا اس کی حفاظت کا سامان کرنا پڑ جائے اور وہ گلی میں نکلنے پر بضد ہو تو میں اسے باہر جانے تو دیتا ہوں مگر اپنے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھتا ہوں۔ کھلی کھڑکی سے گلی میں کھیلتے بچوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں تو اطمینان رہتا ہے.... جب آوازیں مدھم پڑتی ہیں.... یا آنا بند ہو جاتی ہیں تو تب تشویش لاحق ہوتی ہے اور میں لپک کر گلی میں نکل آتا ہوں.... جہاں وہ کسی اجنبی کی چوکھٹ پر یا گلی کی نکڑ سے دوسری طرف کچھ جھانکتا حیران ہوتا ملتا ہے۔

جب وہ دوسری طرف جھانکتا حیران ہوتا ملتا ہے تو تب اسے گھر لانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ وہ رونے لگتا ہے، مچلنے لگتا ہے۔ آگے جانا چاہتا ہے۔ حالانکہ نہیں جانتا کہ آگے کچھ بھی

نہیں۔ بس گلیاں، سڑکیں، دریا، سمندر، جنگل، پہاڑ، جانور اور آدمی اور کچھ بھی نہیں.... مگر یہ گم ہو جانے کی کیسی خواہش ہے میں حیران ہوتا ہوں۔

لڑکپن میں مجھے بھی گم ہو جانے کا بہت شوق تھا۔ ہم لڑکے بالے پٹڑی کے ساتھ ساتھ کسی گاڑی کے پیچھے بہت دیر تک بھاگتے اور جب وہ نکل جاتی تو پٹڑی پر پاؤں رکھ کے اس کے ارتعاش کو محسوس کرتے رہتے.... اور یوں کسی دور دیس کا خواب دیکھتے.... کوئی اور دنیا.... کوئی اور لوگ.... حیرت تجسس جستجو.... ہمیں وہاں ہونا چاہیے تھا.... ہم سوچتے!

اس عمر کی حیرت بھی عجیب ہوتی ہے۔ اچھی بھلی دنیا جادو نگری لگتی ہے.... آدمی تھوڑا سا آگے جانا چاہتا ہے تھوڑا سا اور.... حتی کہ دنیا ختم ہو جاتی ہے۔

عمر کے آغاز پر دنیا ایک جادو نگری تھی جب کوئی پتنگ لوٹتے ہوئے ہم اپنے گھروں سے دور نکل آتے اور ویرانے میں دن سوکھ رہا ہوتا تو درخت آدمی بن جاتے اور آسمان کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ اور سناٹا قہقہے لگانے لگتا اور ہم اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دوڑ لگاتے اپنی اپنی چوکھٹ پر کھڑے ہوتے جہاں ہماری مائیں ہمیں اپنی پناہ میں لے کر چھپا دیتیں۔ اور اندھیرا اور آسمان کی سرخ آنکھیں اور دانت کچکچاتے درخت کسی انجانی دنیا کو پلٹ جاتے اور پھر صبح ہو جاتی۔

مگر جب صبح ہوتی تو ہمیں پھر گم ہو جانے کا چسکا آگھیرتا۔ عمر کے آغاز پر ہر چیز اپنی طرف بلاتی ہے۔ اشارے کرتی ہے۔ آدمی تھوڑا جھجکتا ہے۔ پھر ایک قدم بڑھاتا ہے پھر دوسرا.... پھر بڑھتا ہے اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

"دیکھو.... دور نہ جانا گم ہو جاؤ گے" یہ آواز.... یہ مہربان آواز پھر رفتہ رفتہ پیچھے رہ جاتی ہے۔

یہ آواز، یہ پکارتی ہدایت دیتی تشویش بھری آواز.... میں اپنی ماں کی اس آواز کو جب بھی یاد کرتا ہوں تو مجھے اپنے بچے کے بارے میں تشویش گھیر لیتی ہے۔ پھر میں اپنی ساری توانائیاں سمیٹ کے پکارتا ہوں.... "دیکھو، دور نہ جانا.... گم ہو جاؤ گے۔"

ابھی اس کی اتنی عمر نہیں کہ دور جا سکے مگر مجھے اپنے ایک استاد کا کہا یاد آجاتا ہے اس نے کہا تھا... دیکھو گم ہونے کے لئے دور جانا ضروری نہیں۔ آدمی اپنے گھر کی چوکھٹ کے سامنے بھی گم ہو جاتا ہے اور عین کسی اپنے کی آنکھوں کے آگے بھی۔

درست ہی تھا کہ پھر میں نے دیکھا کہ عمر کے دوراہے پر ہم کئی مرتبہ بس بیٹھے بیٹھے گم ہو گئے کسی کی باتوں میں.... کسی کی آنکھوں میں...!

کسی کی آنکھوں میں گم ہو جانے کا زمانہ بھی عجیب تھا کہ رات اور دن کی تمیز نہ تھی.... گھر کی چوکھٹ کے دونوں طرف گلیاں تھیں... ان دو آنکھوں کی گلیاں..... بھول بھلیاں.... بس چلتے رہو.... جاگتے رہو... مگر لذت میں ڈوبے رہو۔

مجھے ان دنوں ایک عجیب خواہش نے گھیرا تھا.... ان دنوں کہ جب جب میرا بچپن نیا نیا رخصت ہوا تھا... خواہش تھی کہ اس کے گھر کی دیواریں کانچ کی ہو جائیں (اس کی کہ جس کے نرم رسیلے خواب اب بھی میرے تکئے کے نیچے پڑے رہتے ہیں) اور جب وہ میرے پاس نہ ہو میں تب بھی اس کے سایہ دیوار کے تلے کھڑا اسے اندر چلتے پھرتے.... ہنستے بولتے دیکھ سکوں۔

زندگی میں ساری خواہشیں ایسی نہیں ہوتیں جن کے لئے دعائیں مانگنی پڑیں۔ کچھ کے لئے صرف آنکھیں بند کرنی ہوتی ہیں.... تو میری خواہش بھر آئی اس کا گھر کانچ کا ہو گیا.... میں اپنی آنکھیں بند کر کے اسے دیکھ لیتا تھا... چلتے پھرتے... ہنستے بولتے.... (ہائے ری دیوانگی کی عمر)

ہر عمر کے اپنے کھلونے ہوتے ہیں۔ اور ہر کھلونا عام طور پر ناپائیدار ہوتا ہے یا ٹوٹ جاتا ہے.... یا کھو جاتا ہے۔ وہ بھی ایک گڑیا تھی.... دل میں بیٹھی ہوئی کانچ کی گڑیا... چھناکا ہوا اور کرچیاں بکھر گئیں.... دل میں پیوست ہو گئیں۔

کھلونوں کے ٹوٹ جانے کا گم ہو جانے کا کتنا دکھ ہوتا ہے... کوئی بچوں سے پوچھے...!

مجھے یاد ہے کچھ روز پہلے میرے بچے کے ہاتھوں سے ایک کھلونا کھیلتے میں گرا.... گرا اور

ٹوٹ گیا.... کھلونے کا کیا ہے.... ٹوٹ گیا.... سو ٹوٹ گیا.... مگر بالک ہٹ کے آگے، منطق بے کار ہے... وہ رویا اور روتا رہا... روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی.... کون سا حیلہ ہے جو نہیں کیا گیا... کیسا کیسا کھلونا تھا جو اس کے آگے لا کر نہیں رکھا گیا.... حتیٰ کہ ویسی ہی گڑیا... ویسی ہی کانچ کی گڑیا... وہ بھی لا کر آگے رکھی گئی.... مگر اس کی وہی ایک ضد کہ وہی کھلونا وہی کہ جس کی کرچیاں بھی بکھر گئی تھیں.... وہی چاہیے!

ہم اس شام بہت اداس تھے۔ وہ روتے روتے کچھ کھائے پیئے بغیر سو گیا.... اور پھر سوتے میں رات بھر کپکپاتا رہا.... کبھی کوئی پھریری لے کر آنکھیں کھول دیتا اور حیران ہوتا کہ کس بات پہ سسکی لے رہا ہے.... یہ اور بات کہ صبح ہوئی تو وہ سب کچھ بھول چکا تھا... صبح کو نئے کھلونے تھے اور نیا مشغلہ تھا۔

کھلونے اور مشغلے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ عمر بھر جاری رہتا ہے۔ مگر عمر بھر آدمی کی حالت بھی تو اس سوئے ہوئے بچے کی طرح ہوتی ہے جو یوں تو پڑا میٹھی نیند سوتا ہے مگر پھر اچانک کسی بات پر آنکھیں کھولتا ہے حیران ہوتا ہے.... یاد کرتا ہے... کچھ کھو گیا تھا.... کچھ ٹوٹ گیا تھا... شاید یہی خیال کرتا ہے پھر آہ بھر کر پھریری لیتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے... پھر نیند میں گم ہو جاتا ہے۔

"یہ بیٹھے بیٹھے کہاں گم ہو جاتے ہو؟"

یہ سوال میری بیوی نے اکثر مجھ سے پوچھا ہے۔

"کہیں نہیں...... کہیں بھی نہیں...." چونکنے کے بعد عجلت میں اس کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا ہے.... مگر وہ مطمئن نہیں ہوتی... نہیں تم کچھ چھپا رہے ہو... وہ اکثر کہتی ہے۔" میں سن کر مسکراتا ہوں اور خاموش ہو جاتا ہوں!

یادش بخیر... بیٹھے بیٹھے گم ہو جانا کبھی کسی کی باتوں میں، کبھی کسی کی آنکھوں میں.... پھر باتوں اور آنکھوں کو ڈھونڈنا اور اس ڈھونڈنے میں گم ہو جانا... آہ بھرنا.... ایک عجب آنکھ مچولی کا کھیل تھا.... مگر زندگی کھیل کب ہے... اور اگر ہے تو پھر کھیلتے کھیلتے جلد شام ہو جاتی

ہے۔!

شام کے بعد یہ ہمارا معمول تھا کہ ہم بہت سے دوست اکٹھے ہو کر اس بے ہنگم، بے ڈھب اور بے ڈھنگی دنیا کو سنوارنے کے منصوبے بناتے جہاں کھیلتے کھیلتے آدمی کسی ہجوم میں گم ہو جاتا ہے... ہم کہتے جب تک یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں بنتی ہم اسی طرح بھٹکتے رہیں گے...... سو آؤ کوئی حیلہ کریں۔

ہمارا حیلہ کرنا اور کیا تھا؟ دیواروں پر پوسٹر لگانا.... چیخنا، نعرہ زن ہو جانا... دن بھر.... یا رات بھر... حتیٰ کہ صبح ہو جاتی یا شام ہو جاتی... پھر الگ الگ سر جھکائے گھروں کو لوٹ آتے..... یہی تو معمول تھا... پھر دور کہیں کوئی سیٹیاں بجتیں... کوئی تعاقب کرتا... ہم بھاگ کھڑے ہوتے... حتی کہ صبح ہو جاتی یا شام....

یہی تو معمول تھا مگر چیزین ہمیشہ معمول کے مطابق کب چلتی ہیں؟ یہ کونسا گورکھ دھندا ہے.... راستوں سے راستے نکلتے ہیں اور کیا معلوم کون سا راستہ کسی ایک سمت جاتے جاتے کب کسی دوسری سمت سے جا ملے... پھر پیچھے مڑ کر دیکھو تو اپنی حماقتوں پر یا ہنس دو... یا رو پڑو!

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہر آدمی کی قسمت میں ایک دن گم ہونا لکھا ہے اور جب وہ گم ہوتا ہے تو اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ گم ہو چکا ہے... ایک دن یونہی بھاگتے دوڑتے پتنگیں لوٹتے.... تتلیوں کا تعاقب کرتے، دیوارں پر پوسٹر لگاتے... نعرہ زن ہو جاتے کسی اور راستے پر آتا ہے... کسی اور منزل کی طرف چل پڑتا ہے... پھر کہیں برسوں بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کوئی خط.... کوئی چہرہ.... کوئی کھویا ہوا ساتھی... کوئی خواب...

تو جب سب کچھ گم ہو جائے تو پھر کھڑکیوں دروازوں کی جھاڑ پونچھ کرنے، سودا سلف لانے.... بچے کو بہلانے، پھسلانے اور سیر کو لے کر نکل جانے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اگر وہ چھٹی کا دن ہو... ورنہ چھٹی کا کوئی کوئی دن ایسا بھی ہوتا ہے جب رات کا دیکھا ہوا خواب جاری رہنے پر اصرار کرتا ہے.... اگرچہ بس کسی کسی دن۔

تو آج کا دن بھی ایسا ہی چاہیے تھا لیکن میری بیوی جو میرے معمولات کا خود ہی تعین کرتی رہتی ہے۔ بچے کو میرے بستر پر لوٹیں کھانے کو چھوڑ گئی.... وہ کچھ دیر تک اچھلتا کودتا

رہا پھر اس کی آواز آنا بند ہو گئی.... شاید وہ گلی میں نکل گیا ہو گا... نیچے بچوں کا شور موجود تھا.... پھر یہ شور بھی ختم گیا.... شاید بچے بھاگتے ہوئے کسی دوسری سمت نکل گئے ہوں گے.... مجھے پریشانی تھی۔ اس کے کھو جانے کا ڈر تھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ اس کے کھو جانے کا ڈر پیدا ہوا ہو.... پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے... پہلے بھی کئی مرتبہ مجھے گلی میں اتر کر اسے تلاش کرنا پڑا ہے.... کئی مرتبہ اس کام میں شام ہو گئی ہے۔ کئی مرتبہ میں نے اسے کھویا ہے۔ کھویا ہے اور پایا ہے۔

آج بھی ایسا ہی تھا.... وہی گلیاں تھیں.... وہی بازار.... وہی چڑیوں اور تتلیوں کا تعاقب کرتے بچے۔ پتنگیں لوٹتے نوعمر لڑکے... منڈیروں پر چہلیں کرتی لڑکیاں.... اور آتے جاتے انہیں تاکتے جھانکتے شرارت بھرے لڑکے.... اور میں...

.... اور میں بولایا ہوا حیران.... پریشان اور ہراساں.... کچھ کھو گیا ہے.... کچھ کھو گیا ہے....

میں پہلے چیختا رہا... پھر تھک کر بڑبڑانے لگا... اندھیرا بہت ہو گیا تھا.... جب کہیں قریب سے کسی کے قدموں کی چاپ آئی۔ کوئی قریب آیا.... میں نے ملگجے سے اندھیرے میں پہچان لیا.... یہ میری بیوی تھی.... مجھے اطمینان ہوا.... مگر پھر.... بعد میں یہی اطمینان افسوس میں بدل گیا.... میں نے بہت ہی نحیف آواز میں اس سے کہا۔

میں نے آج اسے پھر کھو دیا ہے۔!

اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی بجلی کا بلب جلایا۔ پھر میرے قریب آکر مسکرائی اور کہا۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تم جب بھی تنہا ہوتے ہو گم ہو جاتے ہو۔"

میں نے جواب میں سر اٹھا کر اسے کہنا چاہا کہ میں اپنا نہیں بچے کا ذکر کر رہا ہوں مگر پھر مجھے اپنی چھاتی پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ ساتھ ہی اطمینان کی ایک لہر سی بھی وجود میں آئی.... میں بے کار فکر مند ہو رہا تھا... بچہ تو میری چھاتی پر اوندھے منہ پڑا میٹھی نیند سو رہا تھا دراصل کھویا تو کچھ بھی نہ تھا۔

(تخلیق)

کیا جانوں میں کون

تم تھے؟؟

نہیں تھے۔ تم وہاں نہیں تھے۔ میں وہاں اکیلا تھا۔

اس گھر میں اندھیرا بہت تھا۔ ہاں تھا۔ اس صحن میں دھوپ کا گزر نہیں تھا۔ بالکل نہیں تھا۔ وہ گلی ویران تھی۔ وہ شہر سنسان تھا۔ مگر میں اکیلا تھا تم نہیں تھے۔

تم کہاں تھے؟.... وہاں جہاں درخت تھے، جہاں چڑیاں تھیں۔ درختوں میں ایک درخت میرے صحن میں تھا۔ چڑیوں میں اک چڑیا میرے گھر میں تھی۔ وہ بولتی تھی، میں سنتا تھا۔ میں وہاں اکیلا تھا۔ چڑیا اکیلی تھی، درخت اکیلا تھا۔ وہ گھر اکیلا تھا جہاں میں رہتا تھا مگر تم کہاں تھے؟

تم؟.....

...... وہ درخت جو عین صحن کے وسط میں تھا۔ تم تو نہیں تھے...... تم تھے...... تمہی ہو گے...... ہوا آتی اور درخت کی شاخوں پہ قیام کرتی تب چڑیاں اڑتیں۔ اڑ جاتیں اور پتے خوب زور زور سے تالیاں بجاتے اور کھڑکیاں شور کرتیں۔ وہ چڑیا بھی اڑ جاتی جو میرے گھر میں تھی اور رقص میں ڈوب جاتی اور ناچتے ناچتے ہوا کے ساتھ دور نکل جاتی اور کہیں شام پڑے لوٹتی۔ وہ میں تھا۔ وہ تو میں ہی تھا مگر تم؟ چلو ہو گے۔

ہو گے...... مگر کیا تمہیں یاد ہے.....؟ اگر ہے تب بھی رکو..... مت بولو..... مجھے سنو کہ میں کھو گیا ہوں۔ گئے دنوں میں کھو گیا ہوں۔ یاد ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے ان دنوں کی

جب موسموں سے میری نئی نئی آشنائی ہوئی تھی۔ موسم.....! میرے لئے ہر موسم نیا تھا۔ ہر صبح نئی تھی۔ ہر شام نئی تھی۔ گئے وقت میرے ذہن سے محو ہو جاتے اور ہر لمحہ موجود مجھ پہ غالب آجاتا۔ یہ وہی دن تھے جب مجھے ہجوم دکھائی نہ دیتے تھے۔ ہنگامے سنائی نہ دیتے تھے۔ میں گذر جاتا مگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ میں کہاں سے گذرا تھا۔ وہ کون لوگ تھے... وہ کیا جگہیں تھیں.... میں موسموں کا شیدائی آنے والے موسموں کے انتظار میں رہتا۔ مجھے ان کے رنگوں سے سروکار نہ تھا۔ وہ تو میرے اندر سے پھوٹتے تھے۔ میں مہکتا رہتا کہ میں گلاب تھا۔ میں چنبیلی تھا۔ میرے قدموں کو کون روکتا کہ وہ رقص میں تھے مگر وہ..... وہ کہ جو خود رقص میں رہتے ہیں کبھی کبھی روک لیتے بلکہ اکثر.... تو میں رکتا.. سنناتے پتوں کی صدا پہ رکتا.... چونک اٹھتا۔ یوں لگتا جیسے اس ہوا کو' ان پتوں کو' ان درختوں کو مجھ سے کچھ کہنا ہے.... وہ مجھ سے میرا نام پوچھتے ہیں۔ وہ مجھے کوئی پیغام دیتے ہیں۔ کیا پوچھتے ہو۔ کیا کہتے ہو؟ تو ہر طرف چپ... تم؟.... تم کون ہو؟....... تو ہر طرف چپ۔

تم؟.... تم اے گرجتے برستے بادلو... تم؟ میں تمہیں دیکھنے کے لئے.... تمہیں سننے کے لئے کھڑکی کی سلاخوں سے چمٹا کھڑا ہوں۔ پھوار میرے چہرے پہ پڑتی ہے۔ بارش کچھ کہتی ہے۔ بادل کچھ کہتے ہیں... کیا کہتے ہیں' کچھ بھی نہیں۔ میں گم سم لوٹتا... اسی راستے سے.... تمہیں خبر ہے' وہ راستہ کس قدر سنسان تھا۔ وہاں اس راستے پر جہاں کوئی نہ تھا۔ سوائے اس کے... وہ شاید تم تھے؟.... تم کہاں تھے... چلو تمہی ہو گے... تو تم ملتے... یوں کہ تم ہوتے اور میں نہ ہوتا... چاروں طرف تم ہوتے اور اک شہر ہوتا... بھرا پرا شہر.. چپ کی فصیلیں... سرگوشیوں کی چھت... لوگ ہی لوگ سب وہ... یا شاید تم!

... تو وہ تم تھے؟ چاند جیسی شباہت' پھولوں جیسی مہک۔ تو وہ تم تھے کہ تم پاس آبیٹھتے' کہکشاں پاس آ بیٹھتی درخت پاس آبیٹھتے۔ چڑیاں پاس آبیٹھتیں۔ دریا ہوتا' ہوا ہوتی... چاند ہوتا... پہاڑ ہوتے۔

ہوا رقص کرتی۔ پتے تال دیتے اور گیت گاتے..... چڑیا بولتی... شہر سنتا' سر دھنتا۔

عجب منظر تھے۔ خوشبو منظر، مہک منظر، ہوا منظر کہ جو بگولوں کے درمیان رقص کرتے ہوئے یکبارگی کہیں بلندیوں پر روپوش ہو گئے۔ جب شور اٹھا۔ پانیوں کا شور۔ بپھرتے سمندروں کا شور۔ تال رک گئی۔ ساز تھم گئے دیا بجھ گیا۔ چڑیاں اڑ گئیں، مجاور اٹھ گئے۔ مزار کی چھت سیل آب بہا لے گیا۔ تو میں ظاہر ہوا۔ مگر اس وقت جب میں ظاہر ہوا تو مجھ پہ ظاہر ہوا کہ میرے گھر میں اندھیرا نہیں ہے۔ صحن میں دھوپ ہے بہت سی دھوپ ہے۔ گلی میں شور ہے۔ ویرانی نہیں ہے۔ شہر میں ہنگامہ ہے سنسانی نہیں ہے۔ صحن خالی ہے کہیں کوئی درخت نہیں ہے۔ کہیں کوئی چڑیا نہیں ہے۔ صرف میں ہوں۔

تو تم نہیں تھے... میں تھا!

میں تھا... مگر کہاں تھا۔ کن کے درمیان تھا کہ ایک کھلی سڑک تھی اور لوگوں کا ہجوم۔ میں نے دیکھا اور واویلا کیا... ہٹو مجھے راستہ دو... چھوڑو میں تم میں سے نہیں ہوں۔ میں درخت ہوں۔ میں مہک ہوں... میں گلاب ہوں... میں چنبیلی ہوں... میں خاکستری رنگ کی چڑیا ہوں۔

..... اے لوگو تم نے سنا... میں کون ہوں۔

ہاں ہم نے سنا... تم لوگوں کا ہجوم ہو۔ لوگوں کا جواب تھا تم بسوں کا دھواں ہو... ہل کی انی ہو۔ کارخانے کی چمنی ہو۔ مہینے کی آخری تاریخ ہو۔ آؤ نعرے لگائیں۔ آؤ کہ ہم سب وہی ہیں جو تم ہو۔

یاد ہے اس وقت میں اکیلا تھا۔

تم ان کے درمیان نہیں تھے۔

تم ان کے درمیان نہیں تھے۔

جب انہوں نے مجھے دو حصوں میں بانٹا....

..... مجھے ہجوم دھکیلتا ہوا ساتھ لے گیا... ایک وہیں رہ گیا۔

کیا وہ تم تھے؟

تمہی ہو گے....

مگر اب میں ہوں اور لوگوں کا ہجوم..... تم تو الگ دور کھڑے ہو... مجھے باور آیا چڑیوں کا
چڑیاں ہونا... درختوں کا درخت ہونا... میں صرف میں ہوں اور کچھ بھی نہیں... مگر تم کہتے ہو
کہ یہ تمہاری بھی کہانی ہے۔ میری ہی نہیں۔

مگر کیسے؟..... میں خاکستری رنگ کی چڑیا نہیں۔ مہینے کی آخری تاریخ ہوں... یا شاید نہیں
... درخت ہوں... گلاب ہوں... چنبیلی ہوں... اب بولو... اب تم کہو، میں کون ہوں... ؟

(اوراق)

اور پھر خودکشی

وہ خود ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا اسے بنایا گیا تھا اور باقی ہر شے بدل رہی تھی۔

تو وہ اپنے لئے سوچتا تھا....

یا ایسا کر دے یا ویسا....

ایسا کر دے کہ مجھے کچھ سنائی نہ دے' دکھائی نہ دے۔ بھوک لگے نہ پیاس' کسی کو روتا دیکھوں نہ ہنستا۔ غصہ نہ آئے رنج نہ ہو.... جھلاؤں نہ جھنجھلاؤں نہ.... ہاں ایسا کر دے جیسے پہاڑ جیسے سمندر' جیسے تنکا' جیسے سڑک یا کلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہاں ایسا ہی جنہیں کوئی فرق نہیں پڑتا.... کچھ ہو جائے کوئی فرق نہیں پڑتا....

وہ ایسا نہ بن سکا..... بہت دن ایسا نہ ہو سکا اور ویسا ہی رہا جیسے ہم آپ ہیں..... بس جھلایا ہوا' جنجھلایا ہوا۔ اس کی آنکھیں بھی تھیں جیسے ہماری آپ کی ہیں۔ سو اسے دیکھنا پڑتا تھا ہر اس منظر کو جسے ہم آپ بھی دیکھتے ہیں۔ ہر چند کہ نہیں دیکھنا چاہتے' کان بھی تھے جو سنتے تھے۔ جو سننے پر مجبور تھے۔ تقریریں' نعرے' گالیاں' کوسنے' چیخیں' کراہیں۔

اور پیٹ بھی..... جیسے عمرو عیار کی زنبیل..... بھرتا ہی نہیں۔

اور پاؤں بھی کہ جنہیں جوتیاں چٹخانی پڑتی تھیں صبح و شام

تو صبح و شام.....

گھر سے دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے اور انکار میں بھیگی مسکراہٹیں سمیٹتے سمیٹتے اسے بہت کچھ دیکھنا پڑتا....

سڑکیں، بسیں، موٹریں، ہجوم، مکان، آسمان، پہاڑ، سمندر..... اور ان کے درمیان.....

سانپ، بچھو، کتے، بھیڑیئے، چیونٹیاں، اور وہ خود....

اور وہ خود اور اس جیسے سینکڑوں ہزاروں لاکھوں، کروڑوں......

تو وہ کروڑوں جیسا کیوں بنایا ہے.... بنایا ہی جانا تھا تو مچھر، سانپ، بچھو یا کتا ہی بنا دیا گیا ہوتا کہ جنہیں فرق تو پڑتا ہے.... کچھ ایسا نہیں پڑتا.... جو دیکھتے ہیں سنتے ہیں مگر کڑھتے نہیں.... جن کی بیویوں کے کوسنے کے معدے میں السر نہیں بناتے.... جن کے بچوں کی بھوک انہیں ٹی بی میں مبتلا نہیں کرتی

تو اسے فرق پڑتا تھا...... بہت تھا.... اس کے اندر گدھ بیٹھے تھے جو اسے لہولہان کرتے رہتے تھے.... تو جب اسے تکلیف ہوتی تو وہ چیختا بھی تھا...... کراہتا بھی تھا...... شور بھی مچاتا تھا....

تو تب وہ اپنے لئے سوچتا۔

مجھے ایسا کر دے جیسے درخت کہ اس پر پھول آئے نہ آئے کوئی سائے میں بیٹھے نہ بیٹھے.... کوئی کاٹے یا آگ میں جھونکے اسے کچھ خبر نہیں ہوتی اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا.... یا سڑک کر دے.... کہ کوئی اپنے قدموں سے روندتا پھرے.... اور ٹریفک دندناتی گذرے مگر مجھے کچھ علم نہ ہو...... کچھ خبر نہ ہو۔

کچھ کر دے.... مگر ایسا کر دے میں بے خبر ہو جاؤں، ہر شے سے بیگانہ ہو جاؤں۔ بے نیاز ہو جاؤں۔

تو جب وہ یہ سوچتا تو اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی اس کے ساتھ چلتا ہے اور اس پر ہنستا ہے، اس کی سوچوں پہ مسکراتا ہے۔ وہ جل جاتا، جھنجھلا جاتا۔

تو جب وہ جھنجھلایا ہوا گھر میں آتا تو بس اسے اس کی بیوی اپنے سے بھی زیادہ جھنجھلائی ہوئی ملتی.... تو تب اسے محسوس ہوتا کہ اس کے اختیار میں نہیں ہے جیسا وہ ہو

جانا چاہتا ہے...... تو پھر وہ ویسا بننے کی کوشش کرنے لگتا جیسے ہم آپ ہیں۔.... مگر اس کے ساتھ پاؤں تھے جو جوتیاں چٹخاتے تھے اور پیٹ تھا جس میں گدھ بیٹھے تھے اور بیوی تھی جسے آٹے دال کی حاجت رہتی تھی اور بچہ تھا جسے دودھ پینے کی لت پڑی تھی۔

اور جواب میں اس کے پاس...

اس کے پاس دفتروں کے اندر بیٹھی ہوئی نو و یکنسی NO VACANCY کی بھینگی مسکراہٹیں جو نہ پاؤں میں پہنی جا سکتی تھی' نہ پیٹ پہ باندھی جا سکتی تھیں اور نہ دودھ کی بوتل میں ڈالی جا سکتی تھیں...

تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا جیسا وہ چاہتا تھا کہ بن جائے...... تو تب ایک روز اس نے نہایت دکھ سے سوچا کہ نہ سہی...... وہ تو ویسا ہی رہے کہ جیسا ہے کاش اس کی بیوی اور بچہ ہی ویسے ہو جائیں جیسے درخت' جیسے سڑک' جیسے تصویر...... کہ جنہیں نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس....

مگر وہ پھر خود ہی ہنسا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ہوتا وہی ہے کہ جس کا گمان بھی نہ ہو...... اچانک!

تو اس روز جب وہ گھر میں داخل ہوا تو بیوی اس کے قریب آئی جیسا کہ وہ روز آتی تھی اور حسب معمول کوسنے دینے لگی جیسا کہ وہ روز سنتا تھا...... تو حیران ہوا کہ اچانک اس کی بیوی کی آواز ڈوبنے لگی...... وہ جو کوسنوں اور جلی کٹی باتوں سے لبریز آواز تھی ڈوبتی گئی.... ڈوب گئی.... ہر چند کہ اس کے ماتھے پہ شکنیں بھی بجی تھیں...... ہاتھ بھی زور شور سے ہلتے تھے اور لب بھی...... مگر آواز نہ آتی تھی...... تو تب اس نے اپنے بچے کی طرف بھی دیکھا کہ جو ایک پلنگڑی پہ پڑا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور گویا دودھ کے لئے بلکتا تھا مگر اس کے لبوں سے چیخنے اور چلانے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی.... پہلے تو اسنے انہیں حیرت سے دیکھا' پھر آپ ہی آپ ہنس پڑا کہ شاید وہ دونوں ویسے ہو گئے تھے جیسا اس نے ان کے بارے میں سوچا تھا......

مگر پھر خود کو دیکھا تو پریشان ہوا کہ وہ خود تو ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا اسے بنایا گیا تھا...... مگر وہ زیادہ دیر پریشان نہ رہا کہ یہ اطمینان بھی بہت تھا کہ بارے اسکی کچھ تو سنی گئی...... وہ اپنی بیوی

اور بچے کو دیکھتا تو خوب ہنستا کہ جو بہت دیر سے کچھ کہہ رہے تھے...... غوغا کر رہے تھے مگر لاعلم تھے کہ ان کی تو آوازیں ہی نہیں تھیں کوئی سنتا تو کیا۔

تو وہ ہنستا، قہقہے لگاتا گلی گلی سڑک سڑک گھومنے لگا اور جھومنے لگا کہ باہر کا منظر بھی گھر سے کچھ جدا نہ تھا...... کہ لوگ حرکت میں تو تھے مگر ان کے لب آواز سے عاری تھے...... تو ہر طرف چپ تھی...... ہو کا عالم تھا...... تو کہیں چیخ پکار نہ تھی، آہ و بکا نہ تھی...... بس ایک وہ تھا جس کے قہقہے سناٹے میں گونجتے تھے...... اور لوگوں کا اژدھام کہ جو حیرت سے اسے دیکھتا گذر رہا تھا۔

وہ نہال ہو گیا کہ اب اس کے اعصاب پر سکون تھے...... مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر نہ رہا کہ جب ذرا غور کیا تو کھلا کہ عالم تو وہی ہے، مناظر وہی ہیں...... ایک بس آوازیں ہی تو نہیں آتیں...

تو کچھ ایسا تھا کہ لوگوں کے چہرے اب بھی کھلی کتاب کی طرح اس کے سامنے تھے...... ماتھے کی شکنیں وہی...... بھینگی مسکراہٹیں وہی.... کہ جو ہمارے آپ کی طرح اسے اب بھی دیکھنی پڑ رہی تھیں......

تو وہ گھر لوٹ آیا کہ اب وہ کچھ زیادہ مطمئن بھی نہ تھا...... گھر میں داخل ہوا تو اس سے اپنا گھر دیکھا نہ گیا...... اس کی بیوی اور بچہ اب بھی مچلتے تھے اور بلکتے تھے...... تو ایک کرب کا عالم تھا کہ ان کے لفظ آواز سے عاری تھے...... یوں جیسے کسی نے ان کا گلہ دبا رکھا ہو.... تو اس کے اندر اب بھی کوئی چونچیں مارتا تھا اور لہولہان کرتا تھا۔

تو وہ اتنا لہولہان ہوا کہ اس رات خون تھوکتے تھوکتے بے یقینی کی نیند سو گیا...... سوتے میں خواب دیکھنا اس کی ایسی ہی مجبوری تھی جیسے ہماری آپ کی ہے تو خواب میں اس نے خود کو درخت دیکھا کہ جس پر پرندے چین کی نیند سو رہے تھے اور سائے تلے مسافروں کا بسیرا تھا...... اور اس نے خود کو دریا پایا کہ جس کے اندر چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ادھر ادھر دمیں ہلاتیں ایک دوسرے سے کلیلیں کرتی پھرتی تھیں اور اوپر کنارے پہ چرند پرند اور تھکے ہارے پیاسے

انسان اپنے لبوں کو تر کرتے جاتے تھے اور خدا کا شکر بجالاتے تھے...... اور پھر وہ سڑک بھی بن گیا جو لوگوں کو تیزی سے اپنی منزلوں کی جانب سفر کرنے میں مدد دے رہی تھی...... اور اس نے اپنی بیوی اور بچے کو بھی دیکھا کہ جو ایک خوبصورت تصویر بنے دیوار پر آویزاں تھے جو ہر آتے جاتے کے لئے تازگی اور خوشی کا باعث تھے...... تو اور نہ جانے وہ کیا کیا دیکھتا کہ صبح ہو گئی...... اور اسے جاگنا پڑا کہ روز صبح ہوتی تھی اور اسے روز جاگنا پڑتا تھا۔

تو جب وہ جاگا تو حیران ہوا کہ آج خواب اور تعبیر میں کوئی فاصلہ نہ تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی کہ آج گھر میں بیوی نہ تھی، پلنگڑی پہ بچہ نہ تھا...... اور دیوار پہ کلنڈر تھا کہ جس پہ اس کی بیوی کی تصویر چھپی تھی کہ جس کی گود میں بچہ تھا...... ہر چند کہ اس کی بیوی کے ہاتھ یوں اٹھے تھے جیسے وہ کوسنے دیتی ہو اور بچہ تھا کہ منہ جس کا کھلا تھا اور چہرے پہ کرب کہ جیسے کچھ مانگتا ہو۔

مگر پھر اس نے سوچا کہ یہ تو تصویر ہے اور تصویر کو کسی شے کی کیا حاجت.... اس بات نے اس کے اندر گدگدی کی اور وہ ہنستا رقص کرتا گھر سے باہر چل دیا...... تو باہر نکل کر وہ کچھ اور مسرور ہوا کہ آج گلیاں، مکان، سڑکیں سب ویران تھا، جگہ جگہ اخباروں کے، کلنڈروں کے، کاغذوں کے جھکڑ چل رہے تھے کہ جن پر تصویریں چھپی تھیں...... جلسہ گاہ میں لیڈر نہ تھا...... تصویر تھی...... بہت بڑی تصویر اور اس کے ساتھ نیچے ہجوم...... مکھیوں اور مچھروں کے برابر جن کے سر...... مگر محض تصویر...... تو کہیں بھی کچھ نہ تھا مگر کلنڈر...... مگر تصویریں...... بسیں تھیں کہ جن میں انسان نہیں تاریخیں ٹھنسی تھیں۔

...... سب مہینے کی آخری تاریخیں.. اور ڈپوؤں کے سامنے چیونٹیوں کی قطار تھی اور اندر کلنڈر پہ چھپی ہوئی آٹے کی بوریوں کی تصویریں۔

مگر وہ کچھ دیر ہی خوش خوش پھرا اور پھر رنجیدہ ہوا کہ وہ بہت جلد رنجیدہ ہو جانے والوں میں سے تھا اس نے سوچا کہ سب تو ویسے ہو گئے جیسا اس نے اپنے بارے میں سوچا تھا اور وہ ویسے کا ویسا رہ گیا...... پھر خیال کیا کہ شاید وہ سب میں سے نہیں ہے...... مگر کچھ دیر بعد اسے

اپنا یہ خیال لغو معلوم ہوا کہ وہ بہرحال کبھی سب میں سے تھا...... ہو سکتا ہے وہ' وہ نہ ہو.... بلکہ ایک درخت ہو' سمندر رہو' تنکا ہو...... کلنڈر پہ چھپی ہوئی تصویر ہو یا سڑک ہو اور اسے علم نہ ہو۔

تو اس نے یہ جاننے کے لئے کہ وہ کیا ہے خود کو درخت کی طرح پھیلا دیا مگر شہر تو ویران تھا کون اس کے سائے تلے بیٹھتا...... پھر اس نے دریا بنا چاہا مگر اس خیال سے ترک کیا کہ کہیں گلیوں میں سیلاب نہ آجائے...... وہ سوچتا رہا کہ اچانک اس کی نظر قریب آتی ایک بس پر پڑی کہ جس میں تاریخیں ٹھنسی تھیں...... سب مہینے کی آخری تاریخیں...... تو اس نے قہقہہ لگایا ور تیزی سے آگے بڑھ کر سڑک سے لپٹ کر سڑک ہو گیا...... فورا" بعد ہی وہ ایک بے یقینی کہ نیند سو رہا تھا مگر آنکھیں کھلی چھوڑ کے تاکہ ان میں حیرت جاگتی رہے اور آتے جاتے کو نظر آئے۔

کچھ دیر بعد جب چیونٹیوں کی قطار ادھر سے گذری تو انہیں دیکھنا پڑا کہ سڑک پہ ایک اور سڑک پڑی تھی کہ رنگ جس کا تارکول ایسا نہیں خون جیسا تھا کہ بالاخر وہ ویسا ہو چکا تھا جیسا وہ ہونا چاہتا تھا کہ ہوتا وہی ہے کہ جس کا گمان بھی نہ ہو۔

(سیپ)

کون سنے گا

کون سنے گا

کہانی کہتی ہے مجھے بیان کر..... رات کہتی ہے تجھے کون سنے گا.....

کہانی کہتی ہے تو نگوڑی نیند کی ماری صبح تک تو اونگھنے آجاتی ہے میرا تجھ سے کلام نہیں۔ مسافر تو ٹھہر یہاں بیٹھ ' یہاں الاؤ دہکتا ہے..... سفر موقوف کر..... سفر میں صعوبت ہے۔ آگے جنگل ویرانہ...... درندے ہر نوع کے للکارتے ہیں ' کہیں دریا کے کنارے قیام کر...... خیمہ لگا اور بربط پر کوئی گیت گا.....

رات کہتی ہے.... شب کی دلاری ' مسافر کا کیوں قیام کرنا..... بڑھنا ہی اس کی منزل.... چلنا ہی اس کا قیام...... سفر اس کا وظیفہ ہے اسے تسبیح پھیرنے دے.... کیوں بھلاتی ہے.... سفر کو قیام سے ہمیشہ کا بعد ہے۔

تھکن کہتی ہے مسافر کی منزل اس کے سوا اور کیا ہے مگر کہانی کہنا.... جب منزل پہ پہنچتا ہے تو پاتا کب ہے ' جو کھو دیتا ہے اسے بیان کرتا ہے۔ یہی اس کی منزل ہے۔

سرائے کی دیواروں نے ٹھٹھا کیا..... تھکن جن کا مقدر ہو چپ ان کا حاصل ہوتا ہے.... مگر ہاں بیان کر تجھے ہم سنیں گے....

تھکن کہتی ہے وہاں آسمان کو دیمک لگ گئی تھی جہاں ہمار۶ قیام تھا.... زمین بوسیدہ ہو گئی تھی چلتے میں کڑکڑاتی جیسے کسی خمیازے میں دن بھر کسی کا بدن ٹوٹتا ہے.... اندیشے اور وسوسے نے مکڑیوں کے لئے گھروں میں جالے بن دیئے تھے۔ خوابوں نے پرندوں کے گھونسلوں میں گھر کر لئے تھے اور پیڑ اونچے ہو گئے تھے۔ جب لو چلتی تو ہماری آنکھوں میں

سوکھے پتوں کا انبوہ آتا اور دل میں داخل ہو کر واویلا کرتا...... موسموں نے پھولوں نے اور پرندوں نے وہاں سے کنارہ کیا کہ یکسر موسم بدل گیا تھا اور وہ ظاہر ہو گیا تھا جو اس قیام کا اصل تھا.... حبس کے گھر تھے اور حبس کی دیواریں...... گلیاں اور بازار اوزار اور ہتھیار سب کی فطرت میں گھٹن تھی حبس تھا..... زمین حبس اگلتی تھی آسمان حبس برساتا تھا...... ہم نے ہاتھ بلند کئے کہ جس مشکل پہ اختیار نہ ہو اس کا دعا کے سوا چارہ کیا ہے...... مگر آسمان کو تو دیمک چاٹتی تھی- وہ بوسیدہ اور شکستہ رفتہ رفتہ برادے میں ڈھلتا تھا اور ہمارے اٹھے ہوئے ہاتھ اور پھیلے ہوئے دامن اس سے بھر رہے تھے- انتظار کی پیاس ہونٹوں پر پپڑیاں بن گئی تھی- گھٹن رگوں میں ہو نکتی تو جنگل گونجتا..... دن اور رات کی تمیز کہاں کہ سب کو چلچلاتی دھوپ کھا گئی تھی- ایسا عالم ہو تو کیا قیام کا کوئی مقام ہے؟.... سفر کے سوا چارہ کیا تھا.....

مگر ہم نے نہیں کیا.... مسافر کہتا ہے- دامن تار تار ہو گیا مگر اسے سمیٹا نہیں.... کبھی تو کوئی صبح کوئی ہوا، کوئی بادل ہمارے انتظار کی کشش میں مدار ہونگے- بس اسی سرخوشی میں مبتلا رہے-

صبح اور ہوا اور بادل زمین اور آسمان کے بیچ بھٹکتے پھرتے ہیں- ان کا کوئی ٹھور اور ٹھکانہ نہیں ہوتا- جہاں جگہ دیکھتے ہیں پڑ رہتے ہیں- جب بیزار ہو جاتے ہیں کسی اور منزل کو ہو لیتے ہیں- ان کا انتظار کرنے چاہیے- اے مسافر تو نے اچھا کیا کہ انتظار کیا تھکن کہتی ہے- اور کہتی ہے کہ

جیسے رات صبح کی پنیری لگاتی ہے اسی طرح حبس بھی ہوا اور بادل کے لئے مکان تعمیر کرتا ہے اونچے اور کشادہ مکان...... ہم بے خبر تھے کہ بارہ دریاں تعمیر ہو رہی تھیں.... پرندوں کی کرلاہٹوں میں استقبال کے گیت تھے.... مگر افسوس-

افسوس تیرا حاصل ہے.... سرائے کی دیواروں نے پھر ٹھٹھا کیا.....

.... اور تیرا بھی.... تھکن نے تلملا کے کہا.... خدا شمع کی لو کی عمر دراز کرے جو تجھ پر مسافروں کے سایوں سے نقش و نگار بناتی ہے اور پھر تمہیں دن بھر کے لئے افسوس کے سپرد

کر کے خود ڈھل جاتی ہے.... تیری اور میری حیات کا ایک ہی شعار ہے.... شب بھر کی کہانی ہے..... مت ٹھٹھا کر.... اور مجھے کہانی کہنے دے کہ بے شک افسوس ہمارا حاصل تھا۔

افسوس ہمارا حاصل نہیں تھا' مسافر نے کہا جب بارہ دریوں میں ہوا نے قیام کیا.... کیا ہم وہاں موجود نہیں تھے۔ جب آسمان کو بادلوں نے بانہوں میں لیا.... کیا ہم وہاں موجود نہیں تھے.... ہم ہر اس جگہ تھے جہاں جہاں موسم خوشگوار ہوتا تھا.... یہ ہمارے انتظار کا ثمر تھا.... ہم کھلے میدانوں میں نکل گئے.... گلیوں اور بازاروں میں.... ہر جگہ ہجوم در ہجوم سیراب ہونے کے لئے کہ ہم نے ایک مدت سے اپنا وجود گل و گلزار نہیں دیکھا تھا۔ ہماری آنکھیں گرد آلود تمنا کے سراب میں اب کسی نظارے کی منتظر تھیں...... ہماری سماعتوں کو گرجنے والے بادلوں کی تشنگی تھی.... کھلی سانس لینے کو لب کپکپاتے تھے.... کوئی آندھی کوئی جھکڑ کوئی طوفان..... کہ ڈوب جانے کو' اڑ جانے کو بیتابی نے منزل کر لیا تھا.... اور پھر ہم نے دیکھا بادلوں کو ہوا کو اور صبح کو کہ چاروں طرف ان کا ہجوم تھا.... ایسا نظارہ مدت سے کب ہماری آنکھوں نے دیکھا تھا۔

جیسا چاہا تھا ویسا پا لیا.... گیت گاتے پرندوں سے آسمان بھر گیا...... زمین سیراب ہوئی اور سبزہ بچھایا.... درختوں نے بھورا اوڑھا.... اک سیل آب تھا جس پر ہوا رقص کرتی تھی...... ہم بھی وہاں درختوں کی طرح ا-ستادہ تھے...... ہم نے بھی نظارہ کیا.....

پتھروں کے دل میں بھی گلاب کی خوشبو تھی مگر افسوس.... افسوس؟؟

افسوس جو ہم نے دیکھا تم نے دیکھا وہ سراب تھا تھکن نے کہا...... بادل خوب جھوم کے برسا مگر جسم کی ندی پایاب نہ ہوئی جیسی ریت سے بھری تھی بھری رہی.... پانی ٹھاٹھیں مارتا لہراتا پھرتا تھا.... مگر چلو بھر کر لبوں سے لگایا تو تاثیر نہ تھی.... یوں لگا پانی نہ پیا ہو سانس لی ہو.... پیاس اس طرح ہونٹوں پر منتظر کھڑی تھی کھڑی رہی.... جو ہم نے دیکھا غلط تھا....

جو تم نے دیکھا غلط نہیں تھا.... مسافر نے افسوس سے کہا.... جب رگوں میں گھٹن سرایت کر جائے اور لبوں پہ تشنگی جالے بن دے تو پھر کوئی صبح' کوئی بادل وہاں تک رسائی

نہیں کرپاتے......

میں نے مسافروں کو اپنی تھکن سے دست و گریبان ہوتے ہر شب دیکھا ہے.... سرائے کی دیواروں نے کھنک کر کہا.... ان کی بس اتنی ہی کہانی ہے.... یہ طعن کیا اور او نگھ گئی۔

جب مسافر کو اپنی ہی تھکن کا سامنا ہو تو پھر چپ کو اختیار کرنا ہی مصلحت ہے...... یہ کہہ کر شمع کی لو نے سر نیہوڑایا...... سائے تیزی سے باہر نکل گئے...... نیند نے چھت تان لی..... بس اتنی ہی کہانی ہے....

چپ نہ رہ بیان کر...... کہانی کہتی ہے بیان کر...... رات کہتی ہے کون سنے گا....؟ تجھے کب کسی نے انجام تک سنا ہے. جو' اب سنے گا...... تیری حیات تو میرے ڈھلنے تک ہے...... جب تھکن سو جاتی ہے اور مسافر خواب میں اپنی منزلوں کے شہر تعمیر کرتا ہے...... تب سماعتیں خاموش ہو جاتی ہیں...... کوئی کب سنتا ہے.... تو' تو مسافروں کے لئے نیند کا اک بہانہ ہے...... جو اپنی ہی تھکن سے تکرار کرتے کرتے سو جاتے ہیں...... وہ یہاں تجھے بیان کرنے یا سننے نہیں آتے .... نیند ڈھونڈنے آتے ہیں.... خواب تلاش کرتے ہیں جب پا لیتے ہیں تجھے اگلی شب کے لئے فراموش کرتے ہیں۔

(خیابان)

جب اس نے سنا

جب اس نے کہا کہ اس کا سن پیدائش بحرالکاہل سے بھی پہلے کا ہے تو میں ہنس دیا۔ مگر وہ پرسکون تھا..... میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا..... وہ اسی طرح چھت پر الٹا لٹکے ہوئے گرجا "تم ہنستے ہو..... میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر تک اس کا جسم غصے سے کانپتا رہا..... اور پھر وہ دھم سے میری آنکھوں میں آگرا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں..... وہ میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

"تم ہنس رہے ہو..... تمہیں ہنسنا ہی چاہئے..... بڑھاپے نے تم سے تمہارا حافظہ چھین لیا ہے۔"

"بڑھاپا..... کیسا بڑھاپا؟..... ابھی تو میری عمر صرف بائیس سال ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

بائیس سال پہلے بھی تم بوڑھے تھے..... شاید تمہیں یاد نہیں..... تم میرے ساتھ اسی دائرے میں گردش کرتے تھے..... جو ان سب چھوٹے چھوٹے دائروں سے بڑا ہے..... یہ دائرے جو تمہیں پسند ہیں..... صرف اس لیے کہ یہ دور سے چمکیلے اور خوش نما نظر آتے ہیں..... میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں چمکتی ہوئی تمام چیزیں اچھی لگتی ہیں..... ورنہ تم کبھی وجود میں نہ آتے..... یاد ہے تب ہم دونوں ایک تھے..... تنہائی کے خوف نے ہمیں دو کردیا میں نے تمہیں اس وقت بھی سمجھایا تھا کہ یہ زہریلی کرنیں تمہیں بوڑھا کردیں گی..... اسی لئے تمارا حافظہ کھو چکا ہے۔ اور بینائی بھی کمزور پڑتی جارہی ہے۔

"تم ہذیان بک رہے ہو۔"

شاید اس لئے کہ میں نے تمہیں جنم دیا ہے اور شاید اس لئے کہ تم نے مجھے اپنی آنکھوں کے زندان میں بند کر دیا ہے..... مگر یہ بات مت بھولو کہ تم میرے وجود کا ایک حصہ ہو..... تمہارا جنم میری مرضی سے ہوا ہے..... میں جب چاہوں تمہیں اپنے آپ میں ضم کر سکتا ہوں..... ذرا آنکھیں کھول کر تو دیکھو تم کہیں بھی نہیں ہو..... اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"میں موجود ہوں..... اس لئے کہ دیکھ سکتا ہوں" میں نے کہا اور وہ وہ بکھرتا چلا گیا..... آتش فشاں کے لاوے کی طرح..... اور اب کہیں بھی کوئی دیوار یا چھت یا فرش نہیں تھا..... اور مجھے محسوس ہوا جیسے میں نیچے بہت نیچے گر رہا ہوں.....

"میں ہوں اس لئے کہ بول سکتا ہوں" ..... میں پوری قوت سے چیخا "تم نہیں ہو..... کہیں بھی نہیں ہو..... یہ آواز تمہاری نہیں ہے اس لئے کہ تمہارے ہونٹ ہی نہیں ہیں..... تم صرف ایک سوچ ہو۔"

"تو گویا تم نے مجھے تسلیم کر لیا ہے..... اس لئے کہ میں تمہیں جب چاہوں بکھیر دوں..." اور میں بکھرتا چلا گیا..... چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح..... اور پھر وہ نقطے پھیلنے لگے..... جن کے پس منظر میں اس کے قہقہے تھے..... اور پھر ہر نقطہ ایک صورت اختیار کرتا چلا گیا..... وہ سب میرے ہم شکل تھے.....

اب بتاؤ تمہیں میری باتوں پر یقین آیا۔

"نہیں ..... تم صرف جادوگر ہو"

وہ سنجیدہ ہو گیا..... "ہاں میں جادوگر ہوں..... مگر تمہارا حافظہ تمہیں واپس نہیں کر سکتا..... اگر تمہیں وہ سب باتیں یاد آ گئیں تو تم میرے مدمقابل ثابت ہو گے..... میں کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتا..... مگر تمہیں ان دائروں سے نکلنا ہو گا..... جب تک تم یہاں رہو گے میں نامکمل ہوں..... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا..... اس لیے کہ تم بھی نامکمل ہو....."

"نہیں میں مکمل ہوں..... تم میری فکر نہ کرو..... اور یہاں سے چلے جاؤ"

..... وہ میری طرف بڑھنے لگا..... مگر میں تو کہیں بھی نہیں تھا (اس کے کہنے کے مطابق)

پھر وہ کس سمت کو بڑھ رہا تھا۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا"..... کہاں ہو تم....." میرے جسم میں میری آواز پھیلتی چلی گئی..... خاموشی..... "کہاں ہو تم" (ایک سرگوشی..... جیسے بازگشت) یہ میں نے پوچھا تھا یا کسی اور نے.....

دیواریں..... چھت اور فرش سب اپنی اپنی جگہ پر آ رہے تھے۔ مگر میرا بستر خالی تھا..... بستر پر تو میں موجود تھا.....!!! تھوڑی دیر تک خاموشی کی آڑی ترچھی لکیریں کمرے میں رقص کرتی رہیں۔ اور روشنی پھیلتی چلی گئی..... ٹک ٹک..... کلاک کا پنڈولم ہلنے لگا۔

"ارے تم..... تم ابھی تک یہیں ہو....." وہ پنڈولم کے ساتھ جھول رہا تھا..... (خاموشی).....

کافی دیر میں اس کی طرف دیکھتا رہا..... پھر کروٹ بدل لی..... اب جدھر جدھر نگاہ اٹھتی اسی کا سراپا نظر آتا..... کیلنڈر کی ہر تاریخ پر بھی اسی کی صورت لکھی تھی..... خاموشی مزید گہری ہو گئی۔

"تم بولتے کیوں نہیں۔"

.....(خاموشی)

تھوڑی دیر بعد جب اپنے خالی بستر پر نظر گئی..... تو وہاں بھی وہی براجمان نظر آیا۔

میں اس کی خاموشی سے جھنجلا اٹھا تھا..... اب میں اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا..... کچھ بھی ہو اس کے معجزے قابل داد تھے۔ اور..... کیا خبر میرے ساتھ وہ کب کیا کر بیٹھے..... میں معجزوں سے بہت ڈرتا ہوں..... اسی لیے بات شروع کرنے کے لئے میں نے اس کے الفاظ دھرا دیئے..... "میرا سن پیدائش۔ بحرالکاہل سے بھی پرانا ہے۔"

وہ ہنسا اور دھم سے میری آنکھوں میں آگرا..... جسم کے سارے اعضا چیخ اٹھے..... سگریٹ جلتے جلتے انگلیوں کی پوروں تک پہنچ گیا تھا..... مگر اس کی صورت کہیں بھی نہیں تھی.....

(پنجاب یونیورسٹی لاہور کا مجلّہ "محور" ۷۰-۶۹)

آخر شب

آخر شب لکھنے والے نے لفظوں کا ڈھیر سامنے رکھا عنوان لکھا اور سوچنے کا آغاز کیا۔
رات کے پچھلے پہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنا عام طور پر بند ہو گئیں۔ شاید صبح قریب ہے، گلی کے چوکیدار نے اپنی وسل جیب میں رکھی، لاٹھی اور لالٹین سمیٹی، کسی کونے کھدرے میں پناہ لی اور آنکھیں موند لیں...... پیپل کے پرانے پیڑ پر کسی چیل نے کچھ دیر اپنے پر پھڑپھڑائے شاید کروٹ لی، کسی سوئے ہوئے کتے نے کرلا کر جاڑے کے کرب کا اظہار کیا...... ذرا دیر بعد ایک کوا زور زور سے چلاتا ہوا گذرتا چلا گیا...... اس نے جھک کر درختوں کو دیکھا مگر کہیں پڑاؤ نہیں کیا بس گزرتا گیا اور کرلاتا گیا۔ شاید وہ اپنے آشیاں کی تلاش میں تھا۔ وہ جہاں جہاں سے گذرتا درختوں کے پتوں میں لپٹے کوؤں کے غول بے چینی سے کروٹ بدلتے، کچھ اتھل پتھل ہوتی۔ پھر صرف ایک ہی اڑنے والے کوئے کی کائیں کائیں۔ دور ہوتی ہوئی معدوم ہوتی ہوئی...... پھر خاموشی...... صرف رات ڈھلنے کی پر اسرار چاپ...... باقی سب ساکن...... سب جامد۔ بس چاند نے اپنا سفر سست روی سے جاری رکھا۔ چاندنی اپنا سامان سمیٹتی رفتہ رفتہ دیواروں سے پھلانگتی گزرتی جاتی تھی اور بند دروازوں کی درزوں سے اندر جھانکتی اپنے جانے کا اعلان کرتی تھی...... پھر کہیں اچانک دور کسی ریلوے سٹیشن سے روانہ ہونے والی گاڑی کی وسل سنائی دی۔ اک عجب طمانیت کی آواز۔ رات کا سناٹا اپنی بے چینی سے کپکپا کر رہ گیا۔ مگر گاڑی روانہ نہ ہوئی...... بس اس کی وسل وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ شاید ابھی سگنل نہیں ہوا تھا.... مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ جانے کیا ہوا، پھر وسل

ہلا دینا بھی بند ہوئی اور اس کے چلنے کی آواز بھی نہ آئی۔ اور خاموشی چھا گئی۔ چاروں طرف خاموشی اور چاندنی کا پراسرار سناٹا۔ ہر چیز ایسے چپ جیسے کوئی داستان سناتا ہو۔ اور محو ہو کر اسے سنتے ہوں۔ ہر چیز چپ مگر کچھ ہی دیر...... پھر کہیں قریب سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز...... شاید کہیں دور بہت دور کوئی مسافر گذرا ہو اور کتے نے اس کی بو پائی ہو۔ کتے یوں ہی نہیں بھونکتے...... کچھ ایسا ہی تھا...... کہ قریب آتی ہوئی چاپ...... کوئی بڑی گلی سے گذرتا ہوا جاتا تھا۔ کوئی کام کاج سے لوٹا ہوا شخص یا کوئی مسافر ہو گا۔ گھر لوٹا ہو گا...... مگر اتنی رات گئے؟ چوکیدار نے متحیر ہو کر آنکھیں کھولیں۔ لاٹھی پختہ فرش پہ زور زور سے ماری۔ جاگتے رہو کا نعرہ بلند کیا۔ پھر جاگنے والوں کو خبردار کرنے کے لئے وسل بجائی۔ پھر سوچا اب تو صبح قریب ہے ڈر کیسا اور چپ سادھ لی...... آگے بڑھتے ہوئے قدم ایک ہی لے میں آگے بڑھتے گئے...... مسافر گذرتا گیا...... وہ جہاں جہاں سے گذرتا گلی میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے آوارہ کتے سر اٹھا کر اسے دیکھتے...... کچھ ہلکا سا غراتے' کہیں کہیں تو کھڑے بھی ہو جاتے مگر کوئی اس سے لپٹا نہیں ساری رات دیں اکڑائے کان کھڑے کئے ہانپتے ہوئے کتے شاید تھک چکے تھے۔

گذرتے ہوئے قدموں کی آواز بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی۔ پھر کہیں سے کسی موٹر کے ہارن کا شور سنائی دیا۔ اس کے پہیئے نیم پختہ سڑک پہ اودھم مچاتے اور رگڑ کھاتے ہوئے گذرتے گئے۔ ہیڈلائٹس ادھر ادھر اس کے لئے راستہ بناتیں اندھیرے کو پیچھے دھکیلتیں تیزی سے آگے ہی آگے رواں تھیں پھر یہ شور تھما تو دیر تک کچھ نہ ہوا...... بس خاموشی سی چھا گئی مگر چاند نے اپنا سفر سست روی سے جاری رکھا اور اس سے زیادہ سست ستارے اپنی نشست چوری چھپے بدلتے تھے مگر معدوم ہوتے جاتے تھے...... ار رات کی آوازیں پس منظر میں دور بہت دور ستاروں کے ساتھ ڈوبتی جاتی تھیں۔ اب آوازیں نہ تھیں ان کا شائبہ تھا...... رات کے کناروں پر بس ایک ہلکی سی تہہ تھی کسی درویش کا نعرۂ مستانہ کسی کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ' کسی کتے کی کرلاہٹ...... اب چاندنی سمٹ کر منڈیروں تک آپہنچی

تھی...... اور خاموشی گھمبیر تھی...... اسی باعث بند گھروں کے دروازوں کے پیچھے میٹھی نیند سونے والوں کے خراٹے...... اب گلی میں سنائی دینے لگے تھے۔ نہ جانے کیسے کیسے خواب ان کی آنکھوں پہ اترتے ہوں گے...... خواب دیکھنے والوں کا بھی کچھ ٹھیک نہیں۔ خواب میں آتشدان کے پاس بیٹھے ہوں گے مگر پھر بھی حیرت سے سوچتے ہوں گے کہ آگ سامنے ہے کپکپی پھر بھی نہیں جاتی۔

تو ان کے خراٹے باہر گلی میں سنائی دیتے تھے اور باہر کا سناٹا انہیں اپنے دامن میں سمیٹتا جاتا تھا۔

آخر شب چاند کی روشنی میں دھندلاہٹ شروع ہوئی کہ دھند کی ہلکی سی تہہ نے چاند کے چہرے پہ اپنا مہین نقاب اوڑھ دیا اور اس کے گرد سہ رنگے ہالے بنائے...... سبزی مائل چاندنی دودھیا ہوئی...... یہ رات بیتنے کا عمل ہے کہ جوہڑوں کا پانی دیر تک سردی میں ٹھٹھرتے رہنے کے بعد برف کی صورت سمٹتا جاتا تھا...... کھلے آسمانوں سے اوس آتی اور جہاں جہاں پڑتی کہرے کی صورت سفید ہوتی جاتی.... درختوں کے مرجھائے ہوئے بھیگے پتے گلی میں ہجوم سے الگ تنہا کھڑے یتیم بچوں کی طرح منہ لٹکائے عجب بے چارگی کا شکار لگتے تھے...... رات کا جادو سب کے سرچڑھ کر بولتا تھا۔ اسی باعث ہر طرف چپ تھی۔ اور چپ کا وقفہ بہت طویل تھا...... تاوقتیکہ ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ نے کائنات کو اپنا اسیر نہ کرلیا...... درجہ بدرجہ بڑھتی اور پھیلتی ہوئی مہیب آواز اور گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کی تھرتھراہٹ.... لحظہ لحظہ بڑھتی اور لحظہ لحظہ کم ہوتی ہوئی آواز نے زمین اور آسمان پر خوف کی چادر تانی تو سناٹے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور یوں خاموشی کے اندر خاموشی سرایت کر گئی...... جیسے زمینوں اور آسمانوں سے یک لخت ہر شے غائب ہو گئی ہو...... خاموشی کا یہ وقفہ صدیوں پہ محیط ہوا.... تب کسی کوے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی...... وہ کائیں کائیں کرتا واپس لوٹتا تھا شاید اسے آشیاں کا پتہ نہ مل سکا ہو...... پھر دور ریلوے سٹیشن کی طرف آتی گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی...... قدموں کی چاپ کہ مسافر گھروں کو لوٹتے تھے۔

کسی گھر کی منڈیر پر ایک مرغے نے پر پھیلائے پھڑپھڑاہٹ اور پھر آواز...... اب چاندنی نہیں تھی...... دھندلی سی سفیدی تھی...... یہ چڑیوں کے چہچہانے کا وقت تھا...... لکھنے والے نے کچھ نہ لکھا، سوچنا بند کیا...... قلم ہاتھ سے رکھا، انگڑائی لی اور اپنا بوجھل سر سادہ کاغذوں پہ رکھ دیا۔ کہیں دور اندر بیٹھے ہوئے لفظوں نے پر پھڑپھڑائے اور پھر بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے نکل جاتی ہوئی رات کے ہمراہ پرواز کر گئے..... باہر ہر طرف صبح ہو گئی تھی مگر اندر چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ جیسے کسی نے سفید کاغذ پر سیاہی کی دوات انڈیل دی ہو......

(ماہ نو)

ٹھنڈی نیند کی کونپل

(والد مرحوم کی یاد میں ایک کہانی)

کھلی فضا میں تازہ پھولوں کی مہک تھی مگر جنھوں نے نقاب اوڑھ رکھے تھے وہ اس پر جھکے کھڑے تھے...... وہ اٹھ نہیں سکتا تھا.... ایک طرف پڑے میز پر چھریاں اور قینچیاں سلیقے سے سجی تھیں...... دستانوں میں چھپے ہاتھ ہتھیاروں اور اوزاروں کی طرف بڑھ رہے تھے...... سینے میں دل بج رہا تھا...... عجب بے چینی تھی...... کچھ ہونے والا تھا..... مگر وہ بے بس تھا اور اس پر رفتہ رفتہ غنودگی طاری ہو رہی تھی...... وہ سو رہا تھا حالانکہ وہ نہیں سونا چاہتا تھا- وہ نہیں سونا چاہتا تھا مگر..... سو چکا تھا... وہ گہری نیند سو چکا تھا-

وہ گہری نیند سو چکا تھا مگر یہ کیسی نیند تھی کہ اس کی آنکھیں کھلی تھیں..... اور اب کہیں کوئی بے چینی بھی نہ تھی چاروں طرف سکون تھا.... کھلی آنکھوں کے آگے منظر ہی بدل گیا تھا.... وہ جہاں تھا اب چاروں طرف ہریالی تھی...... تازہ پھول اس کی دسترس میں تھے کہ باغیچے مہکتے تھے- پانی کی لہروں پر روشنی کی کرنیں ہلکورے لیتی تھیں..... روشوں پر پھولوں جیسے بچے ہمکتے پھر رہے تھے- وہ ان کے پیچھے بھاگنے لگا..... ایک ایک کو دیکھنے لگا..... پہچاننے لگا..... اسے لگا وہ بھی ان میں سے ایک ہے.... بچے بھاگتے ہوئے شہر کی گلیوں میں داخل ہو گئے- وہ بھی ان کے پیچھے گیا..... مگر پھر چاروں طرف سناٹا ہو گیا- وہ کہیں روپوش ہو گئے تھے...... وہ اکیلا رہ گیا تھا...... اور اب اکڑوں بیٹھا گھٹنوں میں سر دیئے سوچ رہا تھا..... مگر کیا سوچ رہا تھا.... یہی نا ...... کہ میں کہاں ہوں.....؟ اور یہ بھی کہ کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟

وہ سوچ رہا تھا اور تازہ پھولوں کی مہک اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی۔ اس نے خود پر پھولوں کی پتیاں گرتی محسوس کیں تو سر گھٹنوں سے اٹھا لیا..... سر اٹھایا تو سامنے ایک آنچل سا لہرایا پھر کوئی ہنسی کھنکھنائی.... ایک سایہ پہلو سے نکلا اور ہوا کے ساتھ کسی سمت کو روانہ ہوا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا..... اور پکارنے لگا.... "یہ تم ہو.....؟ اگر تم ہو تو رکو..... ٹھہر جاؤ؟...... میں تو تمہیں برسوں سے تلاش کر رہا ہوں..... ٹھہر جاؤ! رک جاؤ....."
مگر کھنکھناتی آواز کا روپہلا سایہ دھوئیں کی لکیر کی طرح فضا میں پھیلا اور پھر رفتہ رفتہ بکھر گیا۔ اندھیرا ہو رہا تھا..... شام ڈھل رہی تھی.... ڈر لگ رہا تھا..... گلیاں ویران تھیں.... شہر سنسان تھا.... نہ کوئی سنگی نہ کوئی ساتھی..... سب گھروں سے بس ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک کی آواز..... وہ دروازوں سے اندر جھانکنے لگا.... ہر ایک گھڑی کے آگے رک کر دیکھنے لگا..... سوئیاں چل رہی تھیں..... بڑی تیز رفتاری سے چل رہی تھیں..... ان کی رفتار اس قدر زیادہ تھی کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ آگے چل رہی ہیں کہ پیچھے..... وہ گھبرایا تو پلٹ کر گلی میں آیا..... گلی سے ویرانے میں گیا..... اور پھر بھاگنے لگا.... بھاگتا جاتا تھا مگر اسے معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ آگے بھاگ رہا ہے کہ پیچھے.....

وہ بھاگ رہا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے اس کے ہمراہ آوازوں اور سایوں کا اژدھام ہے.... سب مانوس آوازیں.... اس کی عمر کی آوازیں.... مگر سائے.... وہ شناخت نہیں ہوتے تھے...... اور ہوتے بھی کیسے کہ سائے کب کسی سے شناخت ہوئے ہیں..... کہ اسے ہوتے..... "سامنے آؤ.... سب سامنے آؤ .... میں سب کو دیکھنا چاہتا ہوں...... بس ایک بار...... بس صرف ایک بار....." وہ رک گیا.... اور آوازیں دینے لگا... وہ رکا.... تو سائے بھی رک گئے....

جب وہ رکا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کسی ویرانے میں نہیں ہے بلکہ ایک طویل راہداری میں کھڑا ہے.... جس کا دوسرا سرا نہ جانے کہاں ہے.... بس سامنے دور کہیں بہت دور ایسا گمان ہوتا تھا جیسے روشنی ہو.... وہ روشنی کی طرف چل پڑا کہ شاید یہ باہر کا راستہ تھا.... مگر کیسا

راستہ تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا.... پہلے وہ چلتا رہا پھر وہ بھاگنے لگا... "میں کہاں ہوں؟....." وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ چیخ رہا تھا۔ اور راہداری گونج رہی تھی.... چاروں طرف اس کی اپنی ہی بازگشت تھی۔ "میں کہاں ہوں؟ میں کہاں ہوں....؟"

"میں کہاں ہوں...." وہ پکارتا رہا... اور بھاگتا رہا.... اور ادھر ادھر سال خوردہ دیواروں سے ٹکراتا رہا.... اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کرتا رہا.... کہ اچانک بھاگتے میں اس کا ہاتھ ایک دروازے پر پڑا کہ دیوار میں ایک در بھی تھا.....

دیوار میں ایک در بھی تھا اور در کے پیچھے کوئی گھر بھی تھا..... اور بہت سارے کمروں میں سے ایک کی کھڑکی بھی کھلی تھی.... اور کھلی کھڑکی میں سے روشنی بھی نمودار ہوتی تھی.... پھر معلوم نہیں دروازے سے کھڑکی سے یا روزن سے..... مگر وہ کسی طرف سے اس کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف رک کر مبہوت ہو گیا.... سامنے میز پر کہنیاں ٹکائے بکھرے کاغذوں کو حیرت سے تکتا ایک شخص بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

یہ تو میرا کمرہ ہے..... یہ تو میری میز ہے.... یہ میرے کاغذ ہیں.... اور ان پر لکھا ہوا ہر لفظ میرا ہے... کیا میں اپنا لکھا نہیں پہچانتا.....؟ مگر یہ شخص کون ہے؟..... کیا میں ہوں؟......... وہ حیران ہوتا آگے بڑھا.... آگے بڑھا تاکہ سامنے آکر اس شخص کو دیکھ سکے جو اس کے لکھے ہوئے کاغذوں کے سامنے بیٹھا تھا..... مگر جب وہ آگے بڑھا تو ہوا کہیں سے آئی اور کاغذوں کو اڑا اپنے ساتھ کھلی کھڑکی سے باہر لے گئی...... اب اس میز پر کاغذ تھے قلم نہ دوات .... چھریاں تھیں اور قینچیاں تھیں.... پھر اس بیٹھے ہوئے آدمی نے اچانک مڑ کر دیکھا.... اس کے چہرے پر نقاب تھی اور ہاتھوں پہ دستانے.... وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا.... مگر اس نقاب والے شخص نے اسے زیادہ مہلت نہ دی.... میز سے ایک چھری اٹھائی اور اچانک اس کے سینے میں گھونپ دی.... وہ ذرا دیر کو تڑپا اور پھر بے سدھ ہو گیا.....

وہ بے سدھ ہوا تو چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ نقاب پوشوں نے نقاب اتارے دستانے نوچ کر پھینکے اور بھاگ کھڑے ہوئے.... سامنے دیوار پر لگی مشین کے گراف پر اچھلتے کودتے

نکلتے نے اچھلنا کودنا بند کردیا اور سیدھی لائن میں بار بار دوڑنے لگا.... نکلتے کے ساتھ آنے والی اچھلتی کودتی آواز بھی ایک وسل کی شکل میں بجنے لگی.... وہ آواز اس قدر بھیانک تھی کہ سب پرندے درختوں سے اڑے اور اوپر آسمان پر بلند ہو گئے.... پھر وہ وسل بھی خاموش ہو گئی اور نکلتے نے بھی چلنا بند کیا.... سکرین تاریک ہو گئی...... اب خواب میں کوئی منظر نہیں تھا۔ صرف نیند تھی...... ٹھنڈی برف کی طرح یخ بستہ نیند......

سکرین کیا! تاریک ہوئی دنیا تاریک ہو گئی.... چاروں طرف سناٹا چھا گیا.... سناٹا اس کے پورے وجود پہ تھا.... اسکی نس نس میں تھا.... پور پور میں تھا....

.... تو وہ اب ٹھنڈی نیند کے عالم میں تھا...... وہ تو نیند کے عالم میں تھا مگر اس کے اندر..... نہیں بہت اندر..... کوئی دوسرا اب بھی جاگ رہا تھا..... جاگ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اٹھ بیٹھے..... اٹھ بیٹھنا لازم تھا کہ دروازے پہ دستک تھی.... کوئی یاد دلانے آیا تھا اٹھو.... جاگو.... ابھی بہت کام ادھورے پڑے ہیں۔

.... تو اس نے چاہا کہ اٹھے..... دروازے تک پہنچے.... معلوم نہیں باہر کون ہے؟..... وہ اٹھنا تو چاہتا تھا مگر کیسے اٹھتا.....؟ جب اس نے سر اٹھایا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے چھت تو سر سے لگی پڑی تھی.... لگتا ہی نہ تھا کہ اس نے چادر اوڑھ رکھی ہے یوں لگتا تھا جیسے چھت اوڑھ رکھی ہو..... اس نے ادھر ادھر کھسک کر اپنی دانست میں چارپائی سے اترنا چاہا تو یوں محسوس ہوا جیسے چارپائی کے پایوں کے ساتھ دیواریں آ جڑی ہوں۔

تو کیسا ہوا پڑا تھا کہ وہ چت لیٹا تھا.... سر پر چھت پڑی تھی دائیں بائیں دیواریں تھیں.... نہ وہ سر اٹھا سکتا تھا.... نہ پاؤں ہلا سکتا تھا.... اور ہر طرف سناٹا تھا اور گھپ اندھیرا....

وہ گھپ اندھیرے میں ٹھنڈی نیند کے اندر کہیں جاگ رہا تھا اور سوچ رہا تھا رات کیوں ختم نہیں ہوتی..... سناٹا کیوں ختم نہیں ہوتا۔ صبح کیوں نہیں ہوتی.... راستہ کیوں نہیں ملتا....

رات کو تو ختم ہونا ہوتا ہے.... اور اسے معلوم ہی نہ تھا کہ رات تو کب کی ختم بھی ہو چکی اور اس پہ پڑے ہوئے تازہ پھول کب کے مرجھا چکے۔ چاروں طرف اجالا تھا۔ دنیا ہنس

کھیل رہی تھی..... پرندے چہچہا رہے تھے.... مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہیں کوئی جدوجہد سر اٹھا رہی ہے.... زور لگا رہی ہے۔ وہ جدوجہد سر اٹھاتی زور لگاتی رہی حتیٰ کہ جہاں اس کا وجود تھا اس کے اوپر کونپل بن کر پھوٹ نکلی۔

کونپل پھوٹی تو پرندے اس کونپل کے پاس آ بیٹھے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ وہ اسے کچھ دیر دیکھتے رہے پھر سب اڑ کر اپنی اپنی شاخوں پر جا بیٹھے۔ بس ایک چڑیا بیٹھی رہی۔ بیٹھی رہی اور اسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ بھی اڑ گئی۔ مگر وہ اڑ کر درخت پر نہیں بیٹھی بلکہ دور کسی گھر کی منڈیر پر جا بیٹھی۔ اور چہکنے لگی۔ یوں کہ جیسے کوئی پیغام لائی ہو۔

گندھارا